JANUARY
2026
جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور
2026
سالِ نو مبارک

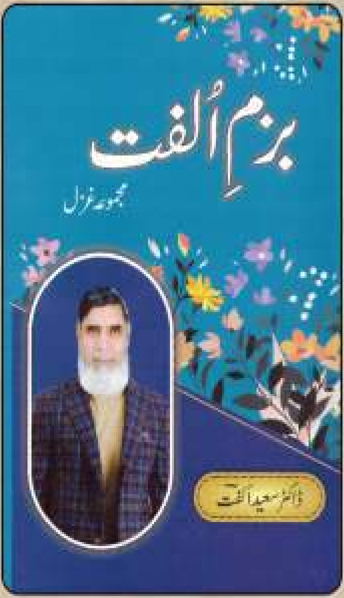
بزمِ اُلفت
مجموعہ غزل
ڈاکٹر سعید الفت

نور نہایا رستہ
جلیل عالی

نہیں

رازِ ایمان
آصف ایمان

غزل

امن کی راہ نکالے
کوئی تو خون اچھالے

ہم تم صف آرا ہیں
پرچم کون سنبھالے

چھین لیے ہل کس نے
دے کر ہم کو بھالے

ایک کے ہاتھ میں پیسہ
ایک کے ہاتھ میں چھالے

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL

Freight Forwarding

Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37083901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - جنوری 2026 - شمارہ نمبر: 1

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: سالِ نو مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ: www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے زرک اینڈ نائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زرفشاں ٹیکسٹائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	اکرم سحر فارانی، رانا محمد شاہد	7 تا 8
2	نعت	جلیل عالی، محمد یٰسین قمر، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز نسیم سحر، اکرم ناصر، اکرم سحر فارانی، سرور حسین نقشبندی	9 تا 16
3	عقیدت	فیض رسول فیضان، مرزا آصف رسول	17 تا 18
4	رباعیات	گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ، سعید اشعر	19 تا 21
5	دوہے	الماس شبی	22
6	ہائیکو	اجمل اعجاز، آفتاب خان	23 تا 24
7	ماہیے	خاور اعجاز	25
8	افسانے	بلقیس ریاض، دردانہ نوشین خان، خالد نذیر، جمیل حیات بابر امین ابر، محمد علی نجیب، رانا محمد شاہد، ثقلین مرزا	26 تا 52
9	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، انور شعور، خاور اعجاز نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، گلزار بخاری، شریف ساجد محمد انیس انصاری، حامد یزدانی، قیوم طاہر، اقبال سروبہ	53 تا 118

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	یعقوب پرواز، سعد اللہ شاہ، مقصود جعفری، مسعود احمد انیس احمد، ہمایوں پرویز شاہد، رضا اللہ حیدر، خالدہ انور شاہد اشرف، واصف سجاد، افتخار الحق، عقیل رحمانی، اکرم ناصر صابر رضا، احمد جلیل، آصف خیال، تنویر قاضی فیض رسول فیضان، مختار آزر کربلائی، اعجاز دانش، نائلہ راٹھور اکرم جاذب، نبیل قیصر، شمشیر حیدر، شبہ طراز، آسناتھ کنول عاصم اعجاز، سمیع اللہ عرفی، اعجاز روشن، شوکت محمود شوکت نبیل احمد نبیل، حماد ریاض، سجاد بلوچ، نبیل قیصر، عابد رضا محمد اشفاق بیگ، وسیم جبران، سید تیمور کاظمی، امر مہکی اورنگزیب حسام حُر، نوید عاجز، اسد رضا سحر، احمد ساقی راجہ عبدالقیوم، عقیل شافی، شبیر نازش، مسکان گل، ناصر شفیع عبدالرؤف زین، عاصم بخاری، رانا محمد شاہد، غضنفر مہدی	53 تا 118
10	مضامین	خاور اعجاز، اسلام عظمی، جمیل احمد عدیل، ظفر معین بلے جعفری حامد یزدانی، عرفان جمیل، سعید اشعر، ابرار عمر، ریاض ندیم نیازی خاور چودھری، عباس علی شاہ ثاقب، دانیال حسن چغتائی افتخار شوکت، افتخار الحق، ساجد فراز شاہجہانی، نعمان منظور	119 تا 220
11	طنز و مزاح خاکہ	سیدہ آمنہ ریاض، اعجاز رضوی	221 تا 226
12	نظمیں	جلیل عالی، احمد جلیل، نثار ترابی، صغیر احمد صغیر سید فرخ رضا ترمذی، شبیر آکاش، امجد بابر، اورنگزیب حسام حر نائلہ راٹھور، بشریٰ شیریں، محمد عبداللہ، اعجاز رضوی	227 تا 241

حمد

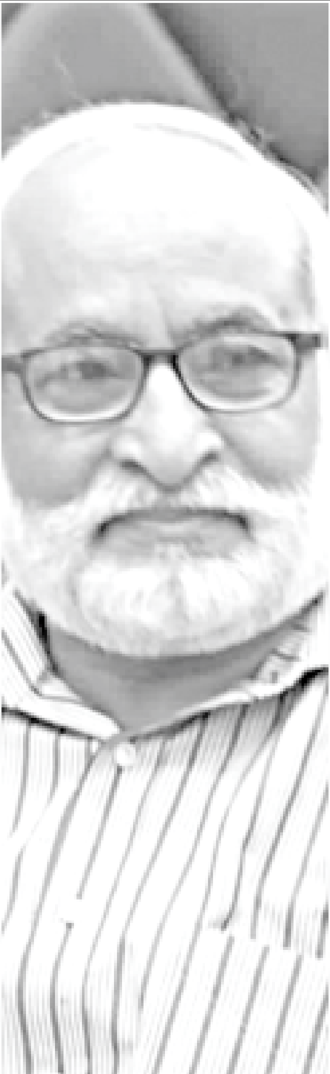

یارب تُو بے مثال ہے سب سے عظیم ہے
واحد ہے لاشریک ہے قادر کریم ہے

تُو ماورا ہے سوچ سے عقل و شعور سے
میری سمجھ سے بالا الف لام میم ہے

تُجھ سے ہر ایک ابتداء تُجھ سے ہی انتہا
ہر سمت جلوہ گر تری ذات قدیم ہے

دیتا ہے رزق اُن کو بھی منکر ہیں جو ترے
لاریب تُو غنی ہے غفور الرّحیم ہے

میری نظر کو جُستجُو تیرے جمال کی
دل میں ضیائے عشق ہے جذبِ کلیم ہے

کرتا ہے پردہ پوشیاں میری خطاؤں کی
تُو کس قدر شفیق ہے کتنا حلیم ہے

اللہ کے الف کی میں تفسیر کیا لکھوں
میرے لئے مُعمّا محمد کا میم ہے

شام و سحر پہ قادرِ مطلق ہے تیری ذات
مسجودِ کائنات خبیرالعلیم ہے

اکرم سحر فارانی

حمد

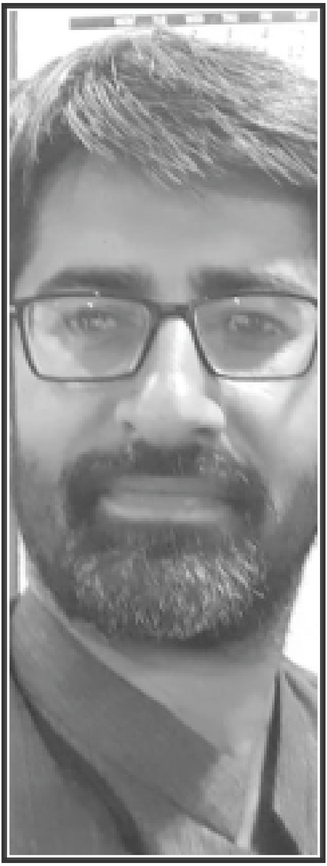

رانا محمد شاہد

شاخ پر پھول پھل اگاتا ہے
روز منظر نئے بناتا ہے

منزلیں جب بھی ہم سے کھو جائیں
وہ نئے راستے دکھاتا ہے

دلکشی بانٹتا ہے چہروں کو
دل میں وہ آگہی سجاتا ہے

ہاتھ کی منحنی لکیروں میں
وہ کئی راز بھی چھپاتا ہے

وہ ہے رازق تمام عالم کا
رزق پتھر میں بھی کھلاتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرا رازق ہے ، رازق خلیوں کا
حمدیں کیا پہنیں ، گجرا گیتوں کا

نعتؐ

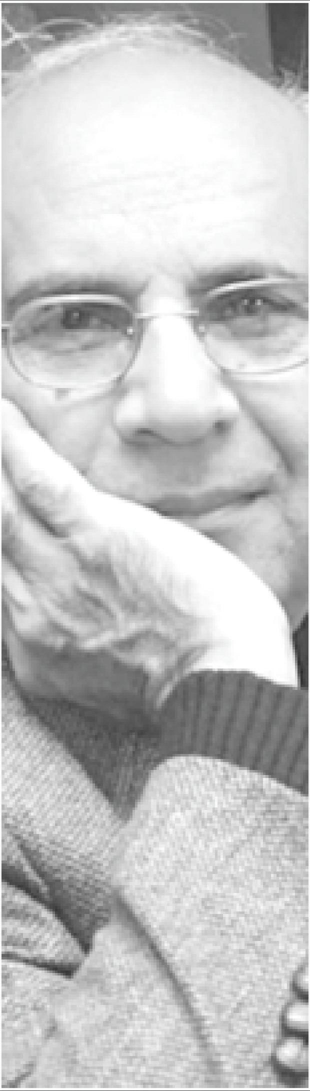

کیا کیا دل و نگاہ پہ اُسؐ کے کرم ہوئے
جو اُسؐ کے راستے پہ چلے محترم ہوئے

اسؐ نے دھرا زمیں پہ قدم اور اس کے بعد
اسؐ کے مطیع زندگی کے زیر و بم ہوئے

کارِ فروغِ دین کیا جو حضور نے
اسباب سارے غیب سے اُس کے بہم ہوئے

کیا احتمال راہ بھٹکنے کا ہے کہ جب
رہبر ہمارے اسؐ کے نشانِ قدم ہوئے

روحِ جمالِ حرف کی معراج پا گئے
جو مدحتِ حضورؐ پہ فائز قلم ہوئے

جو دل مدارِ عشقِ محمدؐ میں آ گئے
بالائے خواب و خوفِ نشاط و الم ہوئے

اس سے بڑی ہے کون سی شاہی جہان میں
عالی شمار اسؐ کے فقیروں میں ہم ہوئے

جلیل عالی

نعتؐ

نُور آمیز ہوئیں خاک بسر کی باتیں
حرزِ جاں جب سے ہوئیں خیرِ بشرؐ کی باتیں

ڈھونڈتا رہتا ہوں نعتوں کے جواہر پارے
اس لیے کرتا نہیں لعل و گہر کی باتیں

تیرگی چاروں طرف حد سے بڑھی جاتی ہے
آؤ کرتے ہیں مدینے کی سحر کی باتیں

میری پلکوں کی منڈیروں پہ دیے جلتے ہیں
جب کوئی کرتا ہے اس نورنگر کی باتیں

آپؐ کا لطف سجھاتا ہے نئی نعت مجھے
علم وفن کرتے ہیں جب عجزِ ہنر کی باتیں

ایسا لگتا ہے مواجہ پہ کھڑا ہوں اب بھی
جاں فزا کتنی ہیں طیبہ کے سفر کی باتیں

جب چھڑے ذکرِ جمالِ رخِ محبوبؐ خدا
اُس گھڑی کون کرے شمس و قمر کی باتیں

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

الٰہی! سرخرو ہونے کا بھی آخر مقام آئے
زبانِ فیض سے مجھ کو شفاعت کا پیام آئے

حروفِ مدعا سے روشنی کی صورتیں نکلیں
مرے لب پر ثنائے مصطفیٰؐ کا وہ کلام آئے

اندھیرا ہے دیارِ غیر میں، ہر سو قیامت کا
اماں مجھ کو ملے یارب! مدینے میں قیام آئے

خدا آباد رکھے آپؐ کی یادوں سے دل میرا
مرے فکر و عمل میں آپؐ کے دم سے دوام آئے

لگایا آپؐ نے سینے سے ترکی ہو کہ تازی ہو
نہیں ہے آپؐ کے در سے جو کوئی تشنہ کام آئے

جب اترا آپؐ پر قرآں، وہ منظر روح پرور تھا
بچشمِ دل وہی دیدار ہو ماہِ صیام آئے

میں اپنے روبرو آقا کا عہدِ ضوفشاں دیکھوں
زرافشاں آبِ کوثر کا مرے ہاتھوں میں جام آئے

بچھاؤں آپ کی راہوں میں پلکیں یا رسولؐ اللہ
فراواں جذبہ وارفتگی دل میں مدام آئے

مری آنکھوں کی دنیا میں بڑی ہریالیاں پھوٹیں
ہوا یہ فیض بھی رحمت کے نامے میرے نام آئے

خدا کا شکر ہے آقاؐ کی نسبت سے ہوا روشن
ریاضِ نعت کے انوار کیا کیا میرے کام آئے

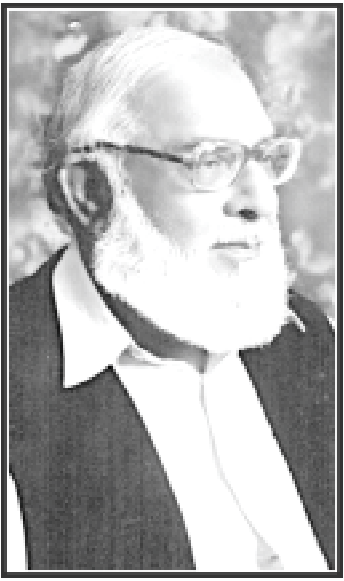

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

اور کیا ربّ سے مِرے دل کی صدا مانگے ہے
نعت کے واسطے کچھ حرفِ ثنا مانگے ہے

بجھ رہی ہیں نئی تہذیب کی قندیلیں پھر
روشنی آپؐ کے قدموں کی ضیا مانگے ہے

دِل پتنگوں کی طرح ڈول رہے ہیں گویا
سانس کی ڈور مدینے کی ہَوا مانگے ہے

مدح کیا ہوگی شہِ کون و مکاں کی مجھ سے
میرا ہر لفظ تو خود اُنؐ سے نوا مانگے ہے

ماند سب نقش ہیں اُنؐ نقشِ قدم کے آگے
ٹوٹ جاتے ہیں قلم ''لوح و قلم'' کے آگے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم میںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ

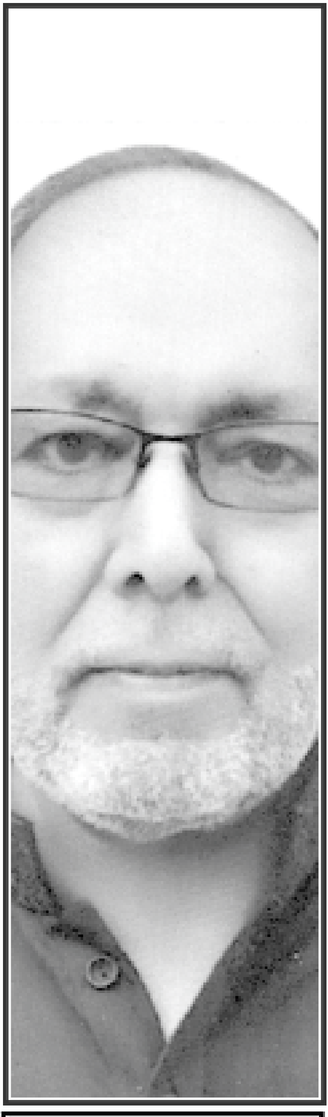

نسیمِ سحر

میرے پیارے نبیؐ ، رونقِ دو جہاں
آپؐ ہی ، آپؐ ہی ، رونقِ دو جہاں

اَور کوئی نہیں ، اَور کوئی نہیں
بس وہی ہیں وہی ، رونقِ دو جہاں

روحِ کون و مکاں آپؐ کی ذات ہے
موجبِ زندگی ، رونقِ دو جہاں

آپؐ کی عبدگی ، آپؐ کی بندگی
بن گئی، بن گئی، رونقِ دو جہاں

جس کا آغاز غارِ حرا سے ہوا
ہے وہی روشنی رونقِ دو جہاں

میری تسبیح پر آپؐ کا ذکر ہے
وِرد ہے ہر گھڑی، 'رونقِ دو جہاں'

نثر میں بھی نسیمؔ آپؐ ہی کو لکھا
نعت میں بھی یہی، رونقِ دو جہاں

نعتؐ

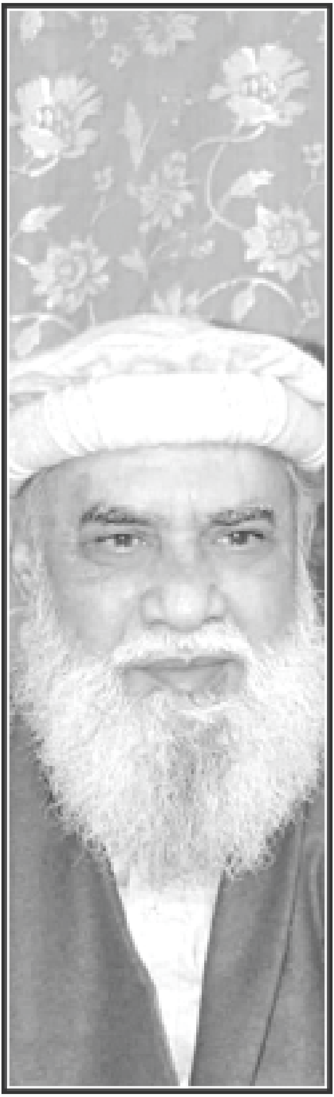

اب مجھ کو بلا لیجیے سرکار کہاں تک
روکوں گا گناہوں کی میں یلغار کہاں تک

جاں جانے کو ہر لمحہ ہے تیار کہاں تک
روکے گی اسے جسم کی دیوار کہاں تک

ان دشمنِ دیں سے مرے آقا مرے مولا
رہتا ہے مجھے برسرِ پیکار کہاں تک

لے آیا تباہی کے دہانے پہ تو مالک
سجتا ہے ابھی کفر کا بازار کہاں تک

یہ بچے مری قوم کا کل ہیں مرے مولا
رہتا ہے انھیں دین سے بیزار کہاں تک

بچھڑے تو بغاوت ہی نہ کر دے مرے مالک
ہے روح مری میری طرف دار کہاں تک

دشمن بھی کہے آپ کو صادق بھی امیں بھی
پہنچاتا ہے انسان کو کردار کہاں تک

صدیوں کا سفر لمحوں میں طے کر لیا سوچو
ہو سکتی ہے براق کی رفتار کہاں تک

اکرم ناصر

نعتؐ

سرکارؐ کا دربار ہے اور دیدۂ حیراں
آئینۂ انوار ہے اور دیدۂ حیراں

دیں جس نے ہمیں ارض و سماوات کی خبریں
وہ کاشفِ اسرارؐ ہے اور دیدۂ حیراں

خود بھوک میں رہ کر جو کھلاتا تھا گدا کو
وہ پیکرِ ایثارؐ ہے اور دیدۂ حیراں

چہرے سے محمدؐ کے برستے ہیں اُجالے
اِک عالمِ انوار ہے اور دیدۂ حیراں

جو عرش کا مہمان ہے قوسین کی زینت
خالق کا وہ شہکار ہے اور دیدۂ حیراں

اے کاش کُھلے مجھ پہ درِ قصرِ حضوری
دل طالبِ دیدار ہے اور دیدۂ حیراں

وہ نعت کی محفل میں ہیں مہمانِ خصوصی
سرکارؐ کی مہکار ہے اور دیدۂ حیراں

اب عرش سے آتی ہے صدا صلِّ علیٰ کی
اِک ساعتِ بیدار ہے اور دیدۂ حیراں

رہتا ہے تصور میں سحرؔ گنبدِ خضرا
ہر شام سحر کار ہے اور دیدۂ حیراں

اکرم سحر فارانی

نعتؐ

قدم قدم کو اٹھائیں تو احتیاط کے ساتھ
نبی کے شہر کو جائیں تو احتیاط کے ساتھ

یہاں پہ حکم ہے آواز پست رکھنے کا
صدائے شوق لگائیں تو احتیاط کے ساتھ

قدم قدم پہ یہاں قدسیوں کا پہرہ ہے
دیار نور میں آئیں تو احتیاط کے ساتھ

مدینے آ کے نگاہیں زمیں پہ ہی رہیں
یہاں نظر کو اٹھائیں تو احتیاط کے ساتھ

یہاں سفر کے لئے ہم مزاج لازم ہے
کسی کو ساتھ بھی لائیں تو احتیاط کے ساتھ

یہاں پہ ضبط میں رکھیے تلاطم جذبات
سو اپنے اشک بہائیں تو احتیاط کے ساتھ

زمین پہ یہ ادب کی ہے آخری منزل
جو حال دل بھی سنائیں تو احتیاط کے ساتھ

یہاں پہ تھام کے رکھیے لگام حضرت عشق
سر نیاز جھکائیں تو احتیاط کے ساتھ

دیار نعت ہے سرور غزل سرائی نہیں
قلم کو اپنے اٹھائیں تو احتیاط کے ساتھ

سرور حسین نقشبندی

عقیدت

جو کہتے ہیں، خدا کوئی نہیں ہے
انہیں اپنا پتہ کوئی نہیں ہے

نوشتے کے مطابق چل رہا ہوں
قصور اِس میں مِرا کوئی نہیں ہے

قسم ہے مجھ کو واحد کی قسم ہے
نہیں ہے دُوسرا کوئی نہیں ہے

مجازی رنگ میں سارے رنگے ہیں
حقیقت جانتا کوئی نہیں ہے

بھرم قائم ہے دیکھو عاصیوں کا
کرم کی انتہا کوئی نہیں ہے

چُھپی کثرت میں ہے فیضانِ وحدت
مگر یوں دیکھتا کوئی نہیں ہے

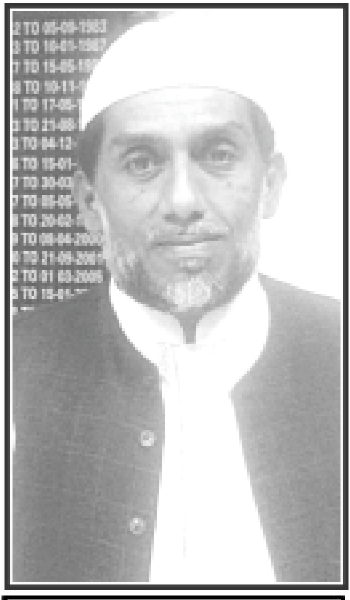

مِرے آنسو ہی کاسہ بن گئے ہیں
زباں پر التجا کوئی نہیں ہے

تمہارے آستاں پر جان نکلے
ہمارا مُدّعا کوئی نہیں ہے

سمندر سے اگر قائم ہے نسبت
تو قطرے کو فنا کوئی نہیں ہے

اگر دیکھو مصوّر کو تو سمجھو
سب اچھے ہیں بُرا کوئی نہیں ہے

فیض رسول فیضان

عقیدت

خوشا جمالِ محمد اور اُن کے نام کے حرف
ہیں اِن کی ضو سے منوّر مرے کلام کے حرف

معین و حامی و مولیٰ و داعی اُن کی صفات
ثنا ہیں نورِ اُتم کی کمال تام کے حرف

عطا ہے صل و سلم علیٰ محمد کی
صلوٰۃِ عشق کا ہر ذکر اور سلام کے حرف

کتابِ اُسوۂ خیرالبشر میں ہو کے رقم
بنے ہیں دین و دیانت جہاں میں کام کے حرف

حضورؐ! ہم پہ کرم پھر کہ، غیر کے ہاتھوں
بکھر گئے ہیں ہمارے ہر اک نظام کے حرف

دلوں کو حُبِّ نبی سے وہ بھر سکے نہ کبھی
ہیں منبروں کا جو سرمایہ اجر و دام کے حرف

ہم اپنے اپنے عقیدوں میں یوں ہیں بے تاثیر
ہوں جیسے خامہ تلک بس خیالِ خام کے حرف

ہے ثبت ختمِ نبوت اور ایسے لفظوں میں
کہ ہیں بنائے وفا اب اِس اختتام کے حرف

ہیں وہ پیمبرِ اقرا رسول سب کی طرف
کہ لوحِ عہد پہ لکھ دیں فلاحِ عام کے حرف

کسی بھی جبر سے گر چاہتے ہو آزادی
دلوں پہ لکھ لو! محمدؐ کے اِس پیام کے حرف

جو کیف چاہیے آصف! تو آمدینے چلیں
متاعِ نعت ہیں طیبہ میں صبح و شام کے حرف

مرزا آصف رسول

رباعیات

اسلام کا رشتہ ہے تا دینی بھائی
البتہ زمیں سے ہیں زمینی بھائی
تلخی کو حلاوت میں بدل دیتے ہیں
میٹھے نہ لگیں کیوں ہمیں چینی بھائی

عیسیٰؑ کو جو فرزندِ خدا کہتے ہیں
کب حامیٔ تثلیث بجا کہتے ہیں
لیکن جو ہو اللہ کے گھر میں پیدا
اے اہلِ بصیرت اُسے کیا کہتے ہیں

اللہ پہ ایمان و یقیں ممکن ہے
انسان ہو مخدوم ، ایسا ممکن ہے
دنیا میں بھی ہیں نعمتیں کیسی کیسی
دنیا میں بھی فردوسِ بریں ممکن ہے

لائے ہمیں کیوں گردشِ افلاک اوپر
ہم خاک نشیں آئیں گے کیا خاک اوپر
دنیا کے سمندر میں ہی دیکھا ہے
نیچے دُر و گوہر خس و خاشاک اوپر

کم ہی مودت کا شرف ہوتا ہے
اکثر کا دماغ اور طرف ہوتا ہے
لازم نہیں عرفانِ علیؑ ہو سب کو
ہر سنگ کہاں دُرِ نجف ہوتا ہے

کیوں چل کے کسی اور طرف سے آؤ
تم سُوئے شرف راہِ شرف سے آؤ
ہے علم کا دروازہ علیؑ شہرِ نبی
منزل ہے مدینہ تو نجف سے آؤ

دن فیض کے فیضان کے راس آ جاتے
قدرت کی طرف قدر شناس آ جاتے
آئے نہ پر و بال میسر ورنہ
جب چاہتے اُڑ کر تیرے پاس آ جاتے

پڑھتے ہیں جو مضمونِ محمد ارشاد
جانے وہی معجونِ محمد ارشاد
دنیا میں نہیں کون پرستار اُن کا
اِک عہد ہے مستونِ محمد ارشاد

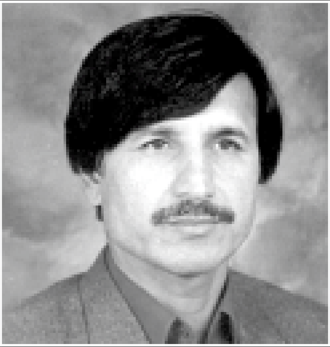

گلزار بخاری

رباعیات

آئینۂ خورشید دکھاتا ساقی
سویا ہوا ہر خواب جگاتا ساقی
شب تاب کر آبگینۂ چشمِ سبو
ساغر سے مرے آنکھ ملاتا ساقی

انسان کا بھگوان بدل جاتا ہے
افلاس میں ایمان بدل جاتا ہے
کھا جاتی ہے مغرور حسینوں کو بھوک
اور عشق کا عنوان بدل جاتا ہے

سیلابِ تمنا نہیں دیکھا جاتا
تر آنکھ میں صحرا نہیں دیکھا جاتا
دل کے پیمانے خود چھلک جاتے ہیں
پیاسا لبِ دریا نہیں دیکھا جاتا

آؤ کہ نیا جہان پیدا کریں ہم
انسان کی بستی میں اجالا کریں ہم
شیطان کو منحرف کریں جنگوں سے
بت سے نہ کسی خدا سے جھگڑا کریں ہم

ساغر میں نشاطِ آرزو رقص کرے
نور مینا بھی چار سو رقص کرے
لے تیز کر اے خواب گزیدہ لڑکی
ڈھولک کی تھاپ پر سبو رقص کرے

لب سوز سوالات نے سونے نہ دیا
پہرے پہ کھڑی رات نے سونے نہ دیا
کچھ قحط پڑا تھا شہر میں خوابوں کا
کچھ باغی خیالات نے سونے نہ دیا

محمد نصیر زندہ

رباعیات

دکھ درد بٹانے کی سہولت کم ہے
یہ عشق ہے، جانے کی سہولت کم ہے
تم خود ہی نکالو کوئی صورت اس کی
رستہ نظر آنے کی سہولت کم ہے

....

چپ چاپ گزرتا ہوں تو میں ڈرتا ہوں
کچھ بات بھی کرتا ہوں تو میں ڈرتا ہوں
جنگل مجھے محفوظ جگہ لگتی ہے
بستی سے گزرتا ہوں تو میں ڈرتا ہوں

....

رہ میں کوئی دیوار ہو لازم تو نہیں
جانا مرا بیکار ہو لازم تو نہیں
یہ سوچ کے جاتا ہوں میں اس کے در پہ
اس بار بھی انکار ہو لازم تو نہیں

....

اک چھوٹا سا فنکار ہوں باتیں کرلو
میں آج بھی بیکار ہوں باتیں کرلو
کوئی نہیں بیٹھے گا مرے سائے میں
گرتی ہوئی دیوار ہوں باتیں کرلو

....

ہٹتا نہیں آنکھوں سے وہ بھولا ہوا شخص
جاتا نہیں باتوں سے وہ بھولا ہوا شخص
خود کو بھی بھلا بیٹھا ہوں اس کوشش میں
مٹتا نہیں سوچوں سے وہ بھولا ہوا شخص

....

وہ کرتا رہا حساب خاموشی سے
پھر چڑھنے لگی چناب خاموشی سے
طوفان کے آنے سے ذرا پہلے ہی
میں پڑھنے لگا کتاب خاموشی سے

....

ہر طے شدہ معیار میں سب جھوٹے ہیں
بیٹھے ہوئے دربار میں سب جھوٹے ہیں
مظلوم کی شنوائی نہیں ہو سکتی
انصاف کے کردار میں سب جھوٹے ہیں

....

بیکار ہیں سارے انھیں عمدہ کہہ دو
چھوڑو یہ اشارے انھیں عمدہ کہہ دو
جیسے بھی ہیں یہ، ایک بڑے آدمی کے
اشعار ہیں پیارے انھیں عمدہ کہہ دو

سعید اشعر

دوہے

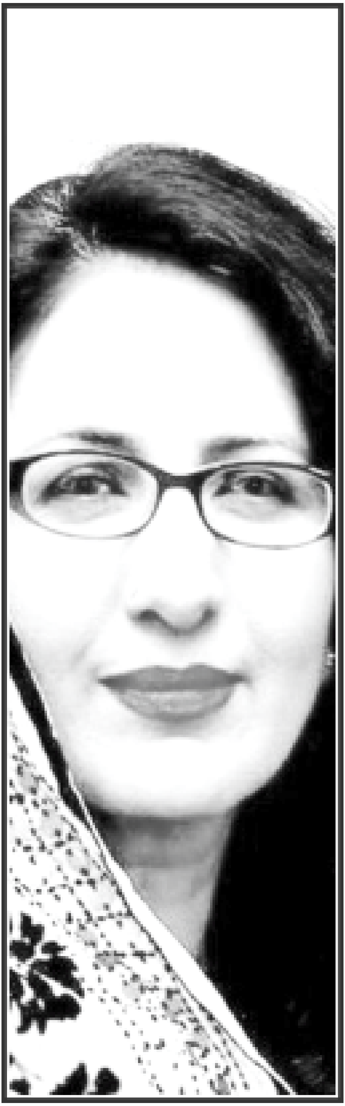

ہولی سا تُو رانگلا ، پھیکا مورا رنگ
دے جا درشن پیاریا، اُترے مورا زنگ

تڑپت کاہے باوری، عشق ہے سچا روگ
اِس رستے کیا سوچنا، کیا سوچیں گے لوگ

تجھ بن مورے بالما، کیسے ہووے عید
کنگھی سُرمہ آئنہ ، مانگیں توری دید

ہم نے اُس سے مانگ لی، دونیوں کی بھیک
اُس کی مرضی سو کرے، جو بھی لاگے ٹھیک

کوا کاٹے جھوٹ پر، سچ پر ڈانٹے ساس
چھٹی کر کے بالما ، بیٹھا مورے پاس

خوشیاں ساری ایک سی، اک جیسے ہی روگ
سرحد کے اُس پار بھی ، اپنے جیسے لوگ

آؤ آؤ باغ میں دیکھو مورے سنگ
ہر تتلی اور پھول نے پہنے تورے رنگ

الماس شبی

ہائیکو

اجمل اعجاز

آیا ہے وہ موڑ
راہ جدا ہو جائے گی
میری بانہیں چھوڑ

رستے میں ہیں ناگ
پیچھے سارے لگ جائیں گے
بھاگ سکے تو بھاگ

عارض پہ ہیں خال
اور جوانی کا نشہ
بہکی بہکی چال

خواب ہوئے غرقاب
بستی ساری ڈوب گئی
آیا ہے سیلاب

کیسے جاؤں بھول
ایک کتاب میں رکھا ہے
پیار کا پہلا پھول

ہائیکو

اشک آئیں تو رو نہیں سکتے
چند بوندیں ہیں اک پیالی میں
جس میں سچ کو ڈبو نہیں سکتے

....

راز داروں کو جس نے چھیڑ دیا
حرف کیسا زباں سے نکلا ہے
دل کے تاروں کو جس نے چھیڑ دیا

....

جانے چپکے سے کیا کہا اُس نے
اُس کی آواز سُن رہا ہے دل
کر دیا کم جو فاصلہ اُس نے

....

دُھندلانے لگا ہے وہ چہرہ
نیم تاریک سی فضاؤں میں
نظر آنے لگا ہے وہ چہرہ

....

کارواں کا غُبار باقی ہے
جینے والوں کو ناز ہے اِس پر
اُس نظر کا خُمار باقی ہے

....

ہم تو ٹوٹے گئے جوانی میں
دیر سے اضطراب نے گھیرا
عکس دیکھا تھا اُس کا پانی میں

ایک آواز ہے وہ خاموشی
نرم لب ہیں خموشیوں کی زباں
دل بھی کرنے لگا ہے سرگوشی

....

گیت چُپ ہیں، کوئی الاپ نہیں
کوئی دستک ہوئی نہیں در پر
مُدتوں سے کوئی بھی چاپ نہیں

....

باغ میں تتلیوں نے رقص کا
مہ جبیں نُور میں نہائی ہے
صحن میں بجلیوں نے رقص کیا

....

کوئی کب سے کھڑا ہے غُرفے میں
چاند کِس اوٹ میں چُھپا جا کر
پاؤں جم سے گئے ہیں زینے میں

....

جسم کے پار ہو نہیں سکتی
اُس کو جتنا بھی دیکھتی جائے
آنکھ بیزار ہو نہیں سکتی

....

سب درختوں کے ہیں بدن گیلے
ایسے چمکی ہیں نیلگوں آنکھیں
سبز پتے بھی ہو گئے گیلے

آفتاب خان

ماہیے

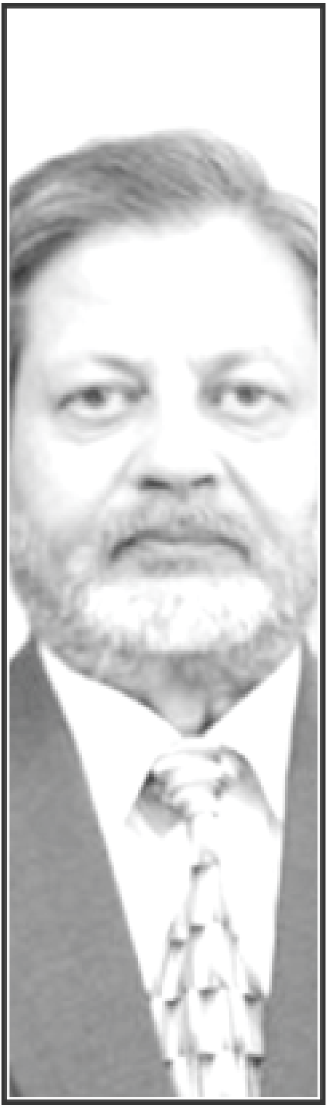

آنکھیں ہیں سرہانے پر
کھولیں گے اِن کو
لیکن ترے آنے پر

برفی میں پستہ ہے
بخش خطا میری
جو نادانستہ ہے

سہرے کی لڑی جاناں
وہ دن کی چھاؤں
پھر دھوپ کڑی جاناں

دیوار سے آگے ہے
مَیں کیسے پہنچوں
وہ دار سے آگے ہے

دیوار کی چھاؤں میں
بیٹھا ہُوا سورج
تکتا ہے خلاؤں میں

خاور اعجاز

سفید گلاب

پام کے درخت جھوم رہے تھے.... ہوائیں درختوں کے پتوں کو چوم رہی تھیں.... آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی تھیں.... چارسو خاموشی چھائی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندہ باندی اس ویرانے میں اتر رہی تھی۔ دور سے کتوں کی بھونکنے کی آوازیں.... اس خاموشی کو چیرتے ہوئے.... اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اکثر اس کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ کر چاندنی کی روشنی میں.... اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر.... کہتی.... تم جا تو رہے ہو.... لیکن میں تمھاری بیوفائی برداشت نہیں کر پاؤں گی.... وعدہ کرو.... تم وفادار رہوگے۔

کیسی باتیں کرتی ہو..... میں نے سچے دل سے تم سے پیار کیا ہے.... میری زندگی میں تمھارے علاوہ کوئی اور نہیں آسکتا۔

''سچ..... لیکن میں بہت خوف زدہ ہوں.... نہ جانے میرے دل میں اطمینان کیوں نہیں ہے''۔

تمھیں تو بس وہم ہوگیا ہے کہ میں وفا نہیں کروں گا۔ لیکن ایک بات اچھی طرح جان لو.... میں مر کر بھی بے وفائی نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔

وہ مسکراتے ہوئے اس کے کندھے سے سر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتی.... تو وہاں.... محبت ہی محبت دکھائی دیتی۔ وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے.... شہزاد ثانیہ کا تایا زاد بھائی تھا جو ایل ایل بی کرنے کے لیے لندن جا رہا تھا.... ان دونوں کی باقاعدہ ہاں ہو چکی تھی.... ان کے والدین چاہتے تھے کہ دونوں کی شادی کردیں تاکہ شہزاد باہر کی دنیا میں.... کسی اور کے ساتھ مراسم پیدا نہ کرے۔ مگر چچا زمان نے حامی نہیں بھری تھی..... ثانیہ کے بارے میں ہی سوچے گا۔ لہٰذا ایک سال کی کوئی بات نہیں ہے دھوم دھام سے شادی کریں گے۔ بھائی بھی لاجواب ہوگیا اور شہزاد باہر کی دنیا میں سدھار گیا۔

موبائل کے ذریعے دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے..... میسج کرتے اور ثانیہ ہر وقت کہتی کب آؤ گے.... وہ جواب دیتا بس چھ ماہ رہ گئے ہیں اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جائیں گی اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔

ثانیہ شام کے وقت باغ میں بیٹھی شہزاد کی یاد

بلقیس ریاض

میں اداس ہو رہی تھی.... بہار کا موسم اپنے جوبن پر تھا....اور ہر رنگ کے پھول اس کے اردگرد میں کھلے ہوئے مسکراتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ثانیہ نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک پیچھے سے کسی نے اپنے ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔ ثانیہ ہڑبڑا گئی۔

”کون“

”بوجھو تو جانو“۔

”کون“ اس نے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تو کسی نے مضبوطی سے آنکھوں کے اوپر ہی رکھے۔

”پلیز.... ہاتھ ہٹائیں“۔

”نہیں پہچانا“۔

”نہیں“

چلو دیکھ کر تو پہچان لوگی۔ وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”راحیل.... تم“

”جی.... جناب ایک ہفتہ کے لیے میں لاہور میں آیا ہوں مگر ماموں جان نے زبردستی مجھے کہا کہ تم نے ہمارے ساتھ ایک ہفتہ گزارنا ہے.... تو میں مان گیا.... جانتی ہو کیوں“۔

”کیوں“

بھئی تمھارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں..... بچپن کے دن ابھی تک نہیں بھولا.... چھٹیوں میں یاد ہے جو لبے پر لڑائی ہوتی تھی۔ اب سامنے خالی جھولا خاموش ہوا کے ہلکوروں سے ہل رہا ہے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے کہ پہلے کون بیٹھتا ہے۔

”راحیل.... تم ابھی تک اتنے باتونی ہو۔ یہ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا.

ثانیہ.... ہم لوگ تو باہر چلے گئے مگر پرانی باتیں ابھی تک نہیں بھولا..... یہ شہزاد نظر نہیں آ رہا۔

وہ لندن چلا گیا ہے.... ایل ایل ایم کرنے۔

”واہ.... کیا بات ہے“۔

”اور تم“۔

”میں امریکہ کے ہسپتال میں سرجن ہوں.... سب کچھ بھول گیا.... غرض کہ آپس کی لڑائیاں بھی.... مگر ثانیہ میں تمھیں نہیں بھول پایا.... بچپن کی یادیں.... سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا ہوں“.

”اچھا“

”جی.... جناب“۔

”جانتی ہو.... ماما کو میری شادی کی بہت ہی فکر ہے مگر میں“۔

”ہاں تم“.... کوئی لڑکی نہیں ملی کیا؟

ثانیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا.... مردانہ حسن کا شاہکار.... نہایت ہی ہینڈسم.... اپنی پرکشش آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا.... ثانیہ ایک دم سے شرما سی گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ یہ کتنا بدل گیا ہے جانے سے پہلے تو اتنا ہینڈسم نہیں تھا۔

شادی کے لیے ماما لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں.... اور میں۔

”کہو“

تمھارے سوا کسی کو نہیں چاہتا.... وقت آ گیا ہے کہ میں اعتراف کر لو.... مجھے بے انتہا

محبت ہے.... بولو... شادی کروگی مجھ سے۔
ثانیہ ٹکر ٹکر اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور زور زور سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ خاموش اس کی نگاہ سفید گلاب کے پھولوں کی طرف اٹھ گئی۔
راحیل سفید گلاب کا پھول توڑ کر ہمیشہ اس کو دیتا... ثانیہ اس کی والہانہ نگاہوں میں اس کی محبت دیکھ رہی تھی.... شہزاد اس وقت اس کے دل میں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا.... جیسے اس دنیا میں اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس وقت اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیا جواب دے۔
''بولو ثانیہ''
''کیا''.... ثانیہ نے اور خالی خالی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔
''راحیل... تمھاری ماما نے نہیں بتایا شہزاد کا رشتہ میرے لئے آیا ہے۔
لیکن نہ تو منگنی ہوئی اور نہ شادی۔
ثانیہ کے سامنے بیٹھا تھا... اور ثانیہ سوچ رہی تھی.... ماضی کی یادیں.... ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ گئیں۔ جاتے وقت اس نے کہا تھا... ثانیہ میں جب کچھ بن جاؤں گا تو پھر آؤں گا تم میرا انتظار کرنا ... میں ضرور آؤں گا۔ وہ جس پڑی باہر جانے والے کبھی نہیں آتے۔
کچھ عرصہ تو اس کی باتوں کو یاد کرتی رہی مگر شہزاد کا جب آمنا سامنا ہوتا تو محسوس کرتی یہ بھی محبت کرتا ہے... راحیل باہر کی دنیا میں گم سا ہو گیا... اپنے کیریئر کو بنانے میں مصروف رہا... اور اس دوران شہزاد کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ شہزاد نے اسے پرپوز کیا تو وہ خاموش سی ہو گئی۔
شہزاد اس وقت باہر کی دنیا میں چلا گیا... مگر جاتے جاتے کہہ گیا مجھے بھول نہ جانا اور میرا انتظار کرنا۔
لیکن جب سے راحیل آیا تو بے چین رہنے لگی.... اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے.... شہزاد آنکھوں سے ایسا اوجھل ہوا کہ یوں لگنے لگا کہ اس کی زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔
وہ راحیل کو وقت دے رہی تھی.... صرف ایک ہفتہ کے لیے آیا تھا.
ماں کے لیے کچھ چیزیں خریدنی تھیں وہ ثانیہ کے ساتھ مال میں خریداری کر رہا تھا... اور جب متعلقہ چیزیں خرید لیں تو دونوں مال کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔
ثانیہ۔
ہونہہ۔
جانتی ہو تمھیں دنیا دیکھنے کا کتنا شوق تھا... تو جب بھی چھٹیاں ہوتی ہیں تو میں کبھی یورپ اور کبھی کینیڈا کے شہروں میں ضرور جاتا ہوں اور تمھیں یاد کرتا کیونکہ تمھیں باہر کی دنیا دیکھنے کا بے حد شوق تھا... اب میں بہت سیٹ ہو گیا ہوں... زندگی میں بہت عیش و آرام کے ساتھ تمھیں رکھنا چاہتا ہوں.... میں والدین سے الگ بڑا خوب صورت گھر تمھارے لئے بنایا ہے.... جہاں صرف تم اور میں رہیں گے۔ کوئی دوسرا ہماری زندگی میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ ثانیہ کو یوں لگنے لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے اور انجانے میں ہی

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔
پھر سوچنے لگی۔
تائی کا پارہ ہمیشہ ساتویں آسمان پر رہتا... پڑھی لکھی نہ ہونے کی وجہ سے جو منہ میں آتا بول دیتی... شہزاد کو تو وہ برداشت کر سکتی تھی مگر گھر کا ماحول اسے پسند نہیں تھا۔ باپ نے اس کی منگنی نہیں کی تھی زبانی ہاں کر دی تھی۔
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راحیل کو کیا جواب دے... اسے خاموش پا کر راحیل نے پکارا۔
''ثانیہ''
ثانیہ نے جھکی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو راحیل کی آنکھوں کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی تھی....
اس کا جی چاہنے لگا.... کاش سب کچھ اپنے آپ ہی اچھا ہو جائے... اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ شہزاد بھی باہر کی دنیا میں چلا گیا ہے اور وعدہ کر کے گیا ہے کہ میں باوفا رہوں گا لیکن اتنا کچھ تو وہ میرے لیے نہیں کر سکتا۔۔
ثانیہ... راحیل نے پھر پکارا... تو آنکھوں میں چھپے آنسو سیلاب کی صورت میں بہنے لگے۔ راحیل اس کی کیفیت دیکھ کر آگے بڑھا اپنے ہاتھوں کے پوروں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ آہستگی سے بولی۔
''میں بہت مجبور ہوں... اور''۔
''اور کیا''
''میں بھی آرام اور سکون کی زندگی جینا چاہتی ہوں''۔
''پھر انکار کر دو''۔
انکار میرے اختیار میں نہیں ہے.... میں اپنے والدین کو ناراض نہیں کر سکتی.... میں مشرقی لڑکی ہوں... ان کو کوئی دکھ نہیں دے سکتی۔
گھر پہنچ کر..... وہ بہت دکھی ہو رہی تھی۔ ماں نے اس کی کیفیت دیکھی تو پریشان ہو گئی.... پوچھا۔
کیا بات ہے.... تمہارا چہرہ کیوں مرجھایا ہوا ہے؟
ماما... تائی جان کی طبیعت تو آپ جانتی ہی ہیں.... ایک ہی گھر میں رہ کر روز چخ چخ بک بک ہونی ہے۔
''مگر شہزاد اچھا لڑکا ہے تمہیں خوش رکھے گا۔ تم اسے چاہتی بھی ہو''۔
''ایسی ماں کے ہوتے کہاں خوش رکھے گا''۔
''علیحدہ بھی ہو سکتا ہے''۔
تائی جان کہہ تو رہی تھی.... ہمارا ایک ہی بیٹا ہے لاء اس لیے کروائی ہے کہ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ ماما میں بہت پریشان ہوں.... شادی کے بعد علیحدہ گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی... اپنی سہیلی عاشی کو فون کر کے ساری حقیقت بتائی اور کہا پلیز تم ہی کوئی رائے دے دو۔
عاشی نے جواب دیا۔
کمال ہے.... اتنا اچھا مستقبل اللہ نے تمہارے سامنے رکھا ہے اتنی عیش اور دنیا کی سیریں تم کرو گی.... اور والدین تمہیں

نہیں دیکھ سکتے۔ آپس میں بڑوں کی لڑائی ہوتی ہے۔ شہزاد تمھارا خیال ہو سکتا ہے۔ تو ثانیہ نے اسے جواب دیا جو بھی ہے وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگ گئی ہوں میں نے اس سے وعدہ لیا ہے کہ تم بیوفائی نہ کرنا۔ وہ تو باوفا رہے گا تو میں سوچتی ہوں کہ میں کیسے اس سے بیوفائی کر لوں حالانکہ میں راحیل کو پسند بھی کرتی تھی.... لیکن وہ کئی سالوں سے باہر تھا تو میں ارسلان کی طرف متوجہ ہوگئی تو عاشی نے کہا..... محبت ---- محبت کس چڑیا کا نام ہے۔ میں تو اس سٹیج پر آن کر محبت کو مانتی ہی نہیں ہوں۔ میں شادی سے پہلے اپنے شوہر مراد کو اتنا چاہتی تھی اور سوچتی تھی کہ مجھ سے زیادہ چاہت تو مراد کی ہے۔ لیکن میرے دل اور دماغ میں مراد بسا ہوا تھا اور مراد ہمیشہ مجھے کہتا تھا کہ میں دنیا چھوڑ دوں گا لیکن تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور شادی کے دوسرے دن ہی وہ شوہر بن گیا دنیا جہاں کی نصیحتیں کیں کہ میرے ماں باپ کا خیال رکھنا میرے بہنوں کا خیال رکھنا اور کبھی کوئی شکایت کا موقع نہ دینا۔ میں حیران تھی کہ یہ وہی مراد ہے اس کو کیا ہو گیا ابھی ایک دن بھی نہیں گزرا اس نے اتنا کچھ مجھے سنا دیا۔ لیکن کیا بتاؤں کہ جوائنٹ فیملی میں رہنا آگ کا دریا عبور کرنے والی بات ہے۔.... مجھ سے پوچھو میں کس طرح گزارہ کرتی ہوں.... ایک نند سسرال سے آتی ہے اور دوسری آن کر میرے سر پر چڑھ جاتی ہے.... سب شوہر اپنے والدین کے تابع ہوتے ہیں.... ثانیہ یہ سن کر بے حد پریشان ہوگئی۔ تو عاشی نے کہا۔

میں نے جو غلطی کر لی ہے وہ تم نہ کرنا .... جوائنٹ فیملی میں رہنا عذاب ہے۔

شام کے وقت وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولنے ہی والی تھی.... کہ راحیل اس کے کمرے میں آ گیا۔

ثانیہ.... باہر چلتے ہیں.... مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔

”لیکن“

لیکن ...ویکن کچھ نہیں..تمھارے پاپا نے اجازت دے دی ہے۔

”اچھا.... ثانیہ نے اس کی جانب دیکھا تو وہ آنکھوں پر مسکراہٹ لیے کھڑا تھا.

میں چینج کر کے آتی ہوں۔

وہ لاؤنج میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

ثانیہ جلد ہی لباس چینج کر کے آ گئی۔ وہ دونوں کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ راحیل نے کافی آرڈر کی اور ثانیہ سے پوچھا۔

ثانیہ سچ سچ بتاؤ... تم نے کبھی مجھے یاد کیا تھا.

راحیل کے سوال سے وہ گھبرا سی گئی۔ کیسے کہتی کہ شہزاد سے اس کی ہاں ہوئی ہے تو بے اختیار اس کا جی کرنے لگا تھا کہ کاش راحیل کا رشتہ میرے لئے آتا۔

”بولو“

"دیکھا تھا... مگر تم نے بھی جا کر مجھ سے رابطہ نہیں رکھا تھا... ان حالات میں اگر میں ہاں کرتی ہوں تو دونوں بھائیوں کی لڑائی ہو جائے گی۔ میں ان کو دکھ نہیں دینا چاہتی"۔

بھائی... بھائی ہوتا وہ لڑ کر بھی ایک نہ ایک دن مل جائیں گے اور تمھاری تائی جان تو ویسے ہی تمھیں پسند نہیں کرتی۔

تمھیں کیسے معلوم ہوا۔

بچپن سے جانتا ہوں۔ ثانیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اچھا... پھر پھپھو جان میرے پاپا سے بات کریں۔

"ہاں پلیز آگے بولو"۔

"مجھے اعتراض نہیں ہوگا"۔ لیکن ساری عمر تم نے وفادار رہنا ہوگا۔ واپس آن کو ماں سے کہہ دیا کہ میں صرف اور صرف راحیل سے شادی کروں گی... پھپھو جان رشتہ مانگیں تو ہاں کر دیں۔ مجھے راحیل پسند ہے۔

ماں ہکی بکی رہ گئی۔

ماما... وہ میرا عندیہ لینے کے لیے اتنی دور سے آیا ہے... انکار نہ کیجئے گا۔ میں اچھی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ شہزاد تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ میں نندوں کی خدمتیں اور جوائن فیملی میں نہیں رہنا چاہتی... ساری زندگی آپ نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ شہزاد کے ساتھ ابھی زبانی ہاں ہی ہوئی ہے... لیکن منگنی تو نہیں ہوئی۔ تائی جان نے آئندہ زندگی میں میرا جینا حرام کر دینا ہے... میں بچپن سے ہی راحیل کو اچھا انسان سمجھتی تھی... اس سے شادی کر دیں... میری خوشی کی خاطر۔

ماں سوچتی رہی... پھر اسے خیال آیا... وہ بیٹی کی خوشیوں کے لیے سسرال سے نہیں ڈرے گی۔

ثانیہ کے والدین... شش و پنج میں مبتلا تھے... کہ بھائی اس سے ناطہ نہ توڑ دے۔

ثریا بیگم راحیل کی والدہ نے اپنے بھائی کو کہا... جب بچے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو انکار کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے ثانیہ بہت خوش رہے گی۔ ثانیہ کے والد نے بڑا سوچ سمجھ کر ہاں کر دی۔

ثانیہ نے کمرے میں جا کر اپنی سہیلی کو فون کیا۔

میری ماں نے ساری زندگی بہت دکھ اٹھائے تھے... تائی جان نے قدم قدم پہ انہیں ذلیل کیا تھا... اور میں نے... تمھارا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے... تم سچ کہتی ہو کہ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتا یہ سب باتیں شادی سے پہلے کی ہوتی ہیں... قسمت اعلیٰ بنانے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ وہی نیکی اور محبت کے جذبات ابھارتا ہے۔ ایک اچھا راستہ چننے کے لیے... اللہ ہی مدد کرتا مجھے اپنی زندگی پر اختیار ہے... دونوں میں سے جسے چاہوں چن لوں۔ میں نے راحیل کو اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے۔

☆☆☆☆☆

درمیان

دردانہ نوشین خان

وجہ تو کوئی نہ تھی انکار کرنے کی۔ لڑکے والے دس مرلے کے پلاٹ پر مکان بنوا کر دینے کو تیار تھے۔ لڑکا سرکاری ملازم تھا۔ شریف اور خوش حال لوگ تھے عزت کرنے اور کرانے والے۔ عنبرین نے ایف اے پاس کر لیا تھا بی اے میں داخلے کے لیے بضد تھی مگر بستی چناب کے غریب لڑکیوں کو اتنا کب پڑھاتے تھے یہ تو عنبرین کا کاشتکار باپ کھلے دماغ کا بندہ تھا عنبرین خوب صورت تھی رشتے آنے لگے تو ماں باپ بھی بیٹی کی شادی کا سوچنے لگے عنبرین کی ماں کو اپنی برادری کا ایک رشتہ پسند تھا۔

''نادر اونچا لمبا سوہنا پٹھان ہے (پٹھان وہ حسن کی مثال کے طور پر کہہ رہی تھی) ہمارے ہم قوم ہیں (قوم وہ ذات کو کہتی تھی)'' روٹی کی چھابی رکھتے ہوئے عنبرین کی ماں نے کہا

''کرتا تو کچھ نہیں ہے'' ابا نے نوالہ توڑ کر شوربے میں ڈبویا

''اس کے ابا کی کپڑے کی دکان ہے''

''دکان اس کے اکیلے ابا کی نہیں ہے چاچا بھی شامل ہے۔ چھوٹی سی دکان ہے ہماری عنبرین بارہ جماعتیں پاس ہے''

دیکھو عنبرین کے ابا جس طرح عنبرین چاند ہے وہ سورج ہے۔ چاند سورج کی جوڑی ہے بستی منہ میں انگلیاں داب لے گی''

''نری شکل۔۔۔''

''یہ اسلم کا پتر۔ کیا مشکل سا نام ہے اس کا۔ شبریز۔۔ اللہ کا بندہ ہے بس''

''اچھا اچھا''

''یہ بھی سوچو۔ نادر کے والدین کو عنبرین کے آگے پڑھنے پہ کوئی اعتراض نہیں ہماری عنبرین کو شوق ہے تو شادی کے بعد پڑھتی رہے گی''

''سوچیں گے''

"سوچیں گے نہیں سوچ لیا میں نے۔ ہماری عنبرین کی شادی نادر چڑھوے سے ہوگی۔ شبریز اسلم غیر ذات انجان لوگ"
ماں نے عنبرین کے باپ کو ہم خیال بنا کے دم لیا
عنبرین کو شبریز سے شادی سے دلچسپی تھی نہ نادر سے۔ تاہم شبریز اسے نادر سے بہتر لگتا تھا ملازم پیشہ اور سنجیدہ مزاج۔ مگر ماں کے پاس وہی گھسے پٹے دلائل تھے ذات برادری۔۔ سوہنا اور آخری حربہ کہ مجھے زیادہ پتا ہے شادی ہوگی۔
شادی ہوتے ہی عنبرین کو اندازہ ہو گیا نادر کی زندگی اپنے آپ سے شروع ہو کر اپنے آپ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا آپ بنا سنوار کر رکھنے کا شوق تھا روز تیار شیار ہو کے لبستی کے آوارہ دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے جاتا کبھی کھوکھے پہ چائے پینے کے لیے کبھی دریا پہ مچھلی پکڑنے کے لیے یوں تیاری کرتا جیسے بڑے دفتر جا رہا ہو۔ شرط لگا کر بازی کھیلنا اور جیت کر تمیں مار خان بننا۔ جوا چلتا تھا اور کھلے عام چلتا تھا۔ اب تو اسے کپڑے استری کر دینے والی پکا کر سامنے رکھنے والی مفت ملازمہ مل گئی تھی دو چار جملے تعریف کے بولتا اور کام کرا لیتا عنبرین نے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے کبھی سننا ہی نہ پسند کیا ناچار عنبرین نے بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ پہلی بیٹی اور بیا ہے ایک ساتھ ہو گئے بی اے پاس کر کے وہ نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی اس کا خواب تھا کہ سرکاری سکول میں اُستانی بن جائے مگر اب کوئی سکول سرکاری ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو گزرے دنوں کی باتیں تھیں آخر اس نے PAF کے سکول میں دس ہزار ماہانہ کی نوکری کر لی وہ سکول کی ہیڈ مسٹرس تھی اس کے تحت دو استانیاں تھیں جو ساڑھے چھ ہزار لیتی تھیں۔ گاؤں میں لوگ نوکرانیاں نہیں رکھتے شہر میں ہوتی تو اس سے دگنے پیسوں پہ گھریلو ملازمہ یعنی نوکرانی بن جاتی۔ نادر کے ابا کی جو امدنی دکان سے ہوتی اس سے گھر کی روٹی پکتی عنبرین اپنے پیسوں سے اپنی بچی کی ضروریات پوری کرتی۔
وہ اکثر سوچتی اس کی شادی نہ ہوتی اگر ہونی تھی تو اس سرکاری ملازم سے ہو جاتی جسے ماں معمولی صورت معمولی لباس بندہ سمجھتی تھی اب وہی ماں کہتی نصیب عورت کے ماتھے لکھا ہوتا ہے وہ جہاں بھی جائے نصیب وہی ملتا ہے مگر وہ نہیں مانتی تھی۔
اب اس نے ایم اے کی تیاری شروع کر دی تھی ایم اے کی تیاری پہ نادر نے اسے شاباش دی بڑی ہمت والی ہے کہا تھا وہ جھگڑتا نہیں تھا مزے سے جیتا تھا جب جوا

جیت جاتا تو اچھی ہوٹل میں دب کے کھانا کھاتا گھر میں بچا ہوا کیک کرالاتا اپنی ماں کو برفی کا ڈبہ لا دیتا ابا کو کہتا کیا کھانا ہے ابا جان لیتا تھا آج حاتم طائی کیوں بنا ہوا ہے وہ کہتا مجھے حرام کے پیسوں سے کچھ نہیں کھانا وہ جو بھی کہتا نادر ہنستا رہتا۔

زندگی کی مصیبتیں کم نہ تھیں اوپر سے سیلاب کی مصیبت آ گئی۔ کسی کو کوئی ہوش نہ رہا مکان سامان عزت جان کی پڑ گئی بس ایک ہی دعا کہ یہ بلا ٹل جائے مگر بلا نہ ٹلی گاؤں کو فوری طور پر خالی کر دینے کے اعلان ہونے لگے رونے پیٹنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا عنبرین ضروری کپڑے بچی کی ضروریات اسناد بیگ میں رکھ رہی تھی نادر اپنے استری شدہ جوڑے ہینگر سمیت اٹھائے آ رہا تھا یہ رکھو۔

"آپ کا دماغ ٹھیک ہے ہینگر نکالو اور کپڑے کم کریں"

"کپڑوں کی استری خراب ہو جائے گی"

اس جواب پہ وہ تپ گئی بولی

"تو کشتی میں ہاتھ میں پکڑے رکھنا" اسے کسی طنز کی پرواہ نہ تھی وہ ماں کے بکسے میں رکھوا لایا

سیلاب زدگان کہیں خیموں اور کہیں اپنے سامان کی اوٹ میں بیٹھے تھے ان کو ایک خیمہ مل گیا جو اگرچہ پھٹا ہوا تھا ساتھ لایا ہوا سامان اس میں رکھ کے عورتیں اندر بیٹھ رہیں مرد باہر چلتے پھرتے کبھی اندر آ جاتے۔

عنبرین بچی کے لیے کھانے پینے کا ساتھ لایا ہوا سامان کفایت سے برت رہی تھی امداد کی انتظار میں دن گزر جاتا عورتوں میں طرح طرح کی باتیں تھیں باتوں اور مچھر مکھی کی بہتات تھی رات کو کتے اس پاس پھرتے رہتے کتے کے کاٹے کی خبر سے دہشت پھیلی ہوئی تھی مگر نادر اپنے حال میں مست تھا اس نے یہاں اپنے جیسے آوارہ ڈھونڈ لیے تھے تاش کی ڈبی بھی ساتھ لے آیا تھا کہنے کو یہ جواب تھا کہ پریشانی سے وقتی چھٹکارا مل جاتا ہے دن باہر گزر جاتا اندھیرا ہونے پہ ماں بیوی کے پاس آ بیٹھتا۔

تیسرے دن چاولوں کے ڈبے آ گئے پیٹ بھرنے کا سامان ہو گیا نادر نے اپنے حصے کا ڈبہ کھایا منہ صاف کیا اور "میں ابھی آیا" کہہ کر نکل گیا ماں آواز دیتی رہی کہتی رہی اس کو کوئی پرواہ نہیں بچی کا دودھ کہاں سے اسے بچی کو ہی باہر چکر لگوا لائے۔۔ مگر چکر تو عورتیں بھی لگوا لاتی تھیں اصل مسئلہ پانی دودھ کھانا اور پنکھے کا تھا ماں کا سمجھاتا باپ کا ڈانٹنا نادر کے لیے لوری کی طرح تھے وہ کوئی توجہ نہ دیتا۔

عنبرین نے بچی کا رونا دیکھ کر فیصلہ کر لیا اپنے سسر سے کہا مجھے امی کے گھر چھوڑ آئیں۔

سسر نے کہا اچھا میں نادر سے بات کرتا ہوں

"اس سے کیا بات کرنی ہے چچا۔۔ آپ

مجھے چھوڑ آئیں انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا میں ہوں یا نہ ہوں کیونکہ یہاں۔ استری ہے نہ بجلی نہ چولھا ہے نہ کھانا تیار کرنا پیش کرنا"
بات تلخ تھی مگر سولہ آنے سچ تھی عنبرین بچی کو اُٹھائے تیار کھڑی تھی ساس پہلے ہی اجازت دے چکی تھی بولی
"جاؤ بیٹی جاؤ سوکھی زمین تو ملے گی پانی یہاں روز چڑھتا آ رہا ہے ہمارے گھروں کا جانے کیا حال ہو گا" عنبرین کا سسر موٹر سائیکل لے آیا وہ بچی کو اٹھائے پیچھے چل رہی تھی۔
بند پر چلتے ہوئے دیکھا ایک طرف سبز قنات لگی تھی جس پر امدادی بینرز لگے تھے لوگوں کا بھی وہاں رش تھا عنبرین نے پوچھا
"چچا یہاں کیا ہو رہا ہے؟"
"مجھے منیر صاحب نے بتایا تھا سرکاری امداد کے لیے ناموں کا اندراج کر رہے ہیں اور ہم بھی نام لکھواتے جائیں"
وہ دونوں جگہ بناتے ہوئے ہجوم میں داخل ہوتے گئے اندر میز کے گرد چار کرسیاں تھیں جن پر دفتری لوگ بیٹھے تھے میز پر لیپ ٹاپ اور رجسٹر رکھا تھا۔
ان میں سے ایک بولا جس کے پاس شناختی کارڈ ہے وہی آئے۔
عنبرین کا سسر جیب میں ہاتھ ڈال کر تلاش کرنے لگا عنبرین بھی اپنا پرس کھولنے لگی کہ اچانک کسی سمت سے آواز آئی۔
"پولیس آ گئی پولیس آ گئی" سب کی توجہ ادھر ہو گئی کام کرنے والوں نے کام روک دیا۔ کیا ہوا پولیس کیوں آئی ہے۔ پولیس کچھ بندوں کو اپنے گھیرے میں لیے گرفتار کر رہی تھی اور عنبرین کی نظر گرفتار ہونے والوں میں موجود نادر پر پڑی وہ چلا اٹھی
"چچا۔۔ نادر۔۔۔ وہ ادھر"
"اوے۔۔ ہاں۔۔ الٰہی خیر" چچا کے اوسان خطا ہو گئے وہ آوازیں دیتے اس طرف لپکا عنبرین سکتے میں کھڑی تھی کرسیوں پر بیٹھے سرکاری کارندوں میں سے ایک نے اونچی آواز میں بتایا
"شبریز صاحب۔۔ جواری پکڑے ہیں جوا لگا کے بیٹھے تھے رومال پہ نوٹ رکھے تھے"
شبریز صاحب؟
عام نام نہ تھا بھولا نہیں تھا عنبرین نے مڑ کر دیکھا وہ جو شبریز صاحب پکارا گیا تھا اس کے کپڑے پسینے میں تر تھے شکن آلود تھے شکل صورت عام سی تھی مگر عزت دار تھا۔
نادر کے جمے ہوئے بال استری شدہ کپڑے پالش شدہ کھیڑی چٹا رنگ نین نقش نمایاں مگر عزت دو کوڑی کا جواری ان دونوں کے درمیان گویا آسمان اور زمین کے درمیان خلا میں معلق عنبرین روتے ہوئے دل کے ساتھ روتی ہوئی بچی لیے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

☆☆☆☆☆

میں پاکستان نہیں جاؤں گا

کچن میں ہلکی ہلکی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اسٹیل کی کیتلی میں اُبلتا پانی ہلکا سا شور پیدا کر رہا تھا، جیسے کسی خاموش صبح میں کوئی پرندہ چپکے سے اُڑان بھرتا ہے۔ سعدیہ نے چولہے کی لو کو ہلکا کیا اور کن انکھیوں سے اپنے بیٹے حسین کو دیکھا، جو سکول سے واپسی پر ٹیبل پر بیٹھا بے دلی سے ٹیبلٹ کی سکرین پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔

اس کی نظریں خالی تھیں... جیسے وہ ہر تصویر، ہر ویڈیو، ہر رنگ کو دیکھتے ہوئے بھی اصل زندگی سے دور تھا۔

”حسین! اس دفعہ چھٹیوں پر جانتے ہو ہم کہاں جارہے ہیں؟“

سعدیہ نے مسکرا کر نرمی سے پوچھا۔

”فرانس... ایفل ٹاور کی سیر پر۔“

اس نے بنا ماں کی طرف دیکھے، اسی طرح بے پروائی سے جواب دیا جیسے یہ سوال نہ نیا تھا نہ جواب۔

”نہیں جی! ہم اس دفعہ پاکستان جارہے ہیں!“

اس نے اس بار لہجے میں معمولی سی سختی شامل کی تاکہ بات کی سنجیدگی واضح ہو جائے۔

یہ موضوع پچھلی بار بھی ان کے درمیان کھنچاؤ کا باعث بنا تھا۔ تب بھی حسین نے جانے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اپنی بیٹی زہرہ بانو کے ساتھ اکیلی پاکستان گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ پندرہ سال بعد بھی اس کے رشتے بدلے نہیں، محبتیں کم نہیں ہوئیں۔ ہر دروازے پر اسے ایسے گلے لگایا گیا جیسے وہ کوئی کھوئی ہوئی دعا ہو جو برسوں بعد قبول ہوئی ہو۔

خالد نذیر

وہ اپنے والد کی قبر پر کھڑی آنسوؤں کے ساتھ دل ہی دل میں عہد کر آئی تھی کہ اب ہر سال یہاں آیا کرے گی۔ یہاں کی محبتوں کے چراغ بجھنے نہیں دے گی۔

مگر آج... حسین ایک بار پھر اس کے ارمانوں پر پانی پھیرنے والا تھا۔

''آخر تم پاکستان کیوں نہیں جانا چاہتے؟''

وہ اس بار خاموش نہ رہ سکی۔

حسین نے ٹیبلٹ ایک طرف رکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا:

''مما، آپ مجھے پاکستان کیوں لے جانا چاہتی ہیں؟ مجھے بتائیں کہ وہاں ایسی کیا چیز ہے جو مجھے لازمی دیکھنی چاہیے... مجھے قائل کریں۔''

وہ ایسے ہی سوالات کرتا تھا — ہر بات پر منطق، ہر بات پر دلیل۔

سعدیہ نے سوچا: یہ بچہ مشرق کا نہیں، مغرب کا بنا ہوا ہے۔ اسے گھروں کی محبتیں، گلیوں کے رشتے، دروازے کھول کر ملنے والی گرمجوشی کا مطلب ہی نہیں معلوم۔

''دیکھو بیٹا... وہاں بہت زیادہ محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ تم ان سے ملوگے تو تمھیں بہت اچھا لگے گا۔''

''اچھا، مجھے دکھائیں وہ لوگ؟''

اس نے سیدھا مطالبہ کر دیا۔

سعدیہ فوراً اپنا موبائل اٹھا لائی اور پچھلے سال کی تصویریں اور ویڈیوز کھول کر حسین کو دکھانے لگی۔ حسین نے پہلی بار ٹیبلٹ سے توجہ ہٹائی اور ماں کے فون کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں ہر تصویر پر ٹھہر کر جیسے کوئی الگ ہی حساب لگا رہی تھیں۔

کچھ لمحوں بعد اس نے موبائل ماں کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

لگ رہا تھا جیسے اس نے فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہو۔

They are not good people

''مما...... پاکستان بالکل بھی اچھی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ان سب لوگوں کے چہرے دیکھیں، سب بہت اداس ہیں۔ آپ خود بتائیں، جہاں اتنے اداس لوگ رہتے ہوں وہ جگہ اچھی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں پاکستان ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

سعدیہ ایک ٹھنڈی گہری سانس لے کر رہ گئی جو اس کے پاکستانی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

معیار

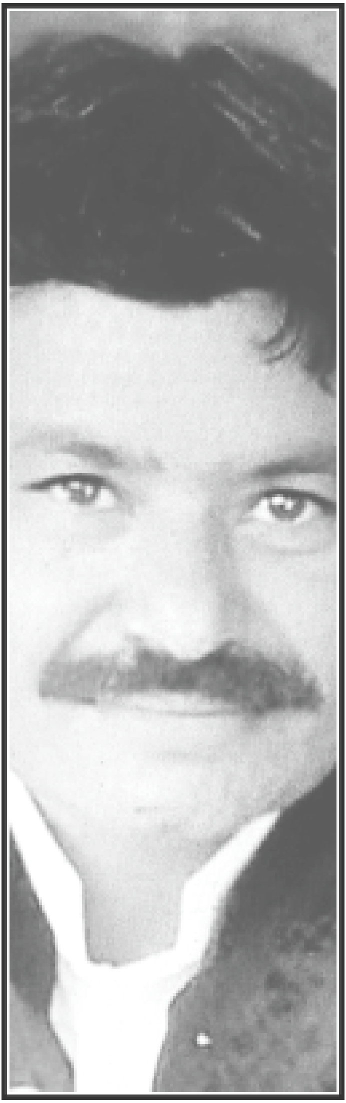

جمیل حیات

محبت علی بڑا پُرجوش دکھائی دے رہا تھا، احمر نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا: "یار! میں نے ایک ایمرجنسی ریلیف فنڈ قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے، جس میں ہر بندہ ایک ماہ میں دو ہزار روپے جمع کرائے گا اور ایک سال میں یہ پیسے جمع کرانے ہوں گے۔ اس طرح ہر شخص کی طرف سے چوبیس ہزار روپے جمع ہو جائیں گے۔" احمر نے اسے نان سٹاپ بولتے دیکھا تو اس کی بات اُچک لی: "لیکن اس کا فائدہ" محبت علی نے اسی جوشیلے لہجے میں جو اس کی پہچان تھا کہا: "جناب! یہ پیسہ ہمارے انھی ساتھیوں کے کام آئے گا کسی بھی ایمرجنسی کی صورت یعنی سنگین بیماری کی صورت یا سرجری یا مہنگے علاج کی صورت، اس میں سے وہ پیسے لے سکے گا اور پھر چھ ماہ کی مدت میں اسے واپس کرنا ہوں گے تاکہ یہ سلسلہ چلتا رہے۔"

احمر نے ایک بھرپور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی: "تمھارا کیا خیال ہے کتنے لوگ اس خیال کی تصدیق کریں گے؟" اس نے کہا "بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

محبت علی بات کا دھنی تھا جس کام کا ارادہ

کر لیتا اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کے دم لیتا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا جس میں دو سو کے قریب ملازمین کام کرتے تھے، یہ کمپنی ملازمین کو اچھی تنخواہ دینے کے ساتھ ساتھ مراعات سے بھی نوازتی تھی اس لیے مہینے میں دو ہزار روپے نکال لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا پھر بھی دو سو میں سے صرف اسی ملازمین نے اس کی آواز پہ کان دھرے یوں یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک سال بعد اس کے پاس ایک معقول رقم اکٹھی ہو گئی۔ یہ انیس لاکھ روپے تھے۔ اس نے ایک کمیٹی بنانے کا کہا جو پانچ سینئر لوگوں پر مشتمل ہو لیکن سب نے اس پر اعتماد کیا اور یوں رقم اس کے پاس امانت رہی۔

اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ سب سے پہلے وہ خود بیمار ہوا، اسے دل کا دورہ پڑا فوری طور پر طبی امداد مل گئی اور پھر اس کا علاج شروع ہوا۔ علاج مہنگا تھا لیکن اس نے اس فنڈ سے رقم لینے سے انکار کر دیا کہ یہ اس کے پاس لوگوں کی امانت تھی۔ احمر اُسے اچھی طرح جانتا تھا وہ نیک دل تو تھا ہی لیکن امانت دار بھی تھا۔ اللہ نے اسے زندگی دی اور وہ دوبارہ اپنی ملازمت پر آ گیا۔

اسی دوران ایک خاتون کے شوہر کا اچانک انتقال ہو گیا، اس نے آدھے گھنٹے کے دورانیے میں مطلوبہ رقم مہیا کر دی، پھر اسی طرح ایک ملازم کے والد کی بیماری کی صورت میں رقم اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی گئی۔ یوں بھلائی کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ لوگ رقم فنڈ سے لیتے اور پھر مقررہ مدت میں واپس بھی کر دیتے لیکن احمر نے کچھ عرصے سے یہ مشاہدہ کرنا شروع کیا کہ محبت علی اب پریشان سا رہنے لگا ہے۔ اس کے پوچھنے کے باوجود اس نے کوئی بات نہیں کی۔

”یار! یہ بتا کہ یہ جو، ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ وہ ہر وقت باوضو رہتے ہیں، کیا انھوں نے یا ان کے ساتھ چپکے رہنے والے لوگوں نے بھی اس کار خیر میں حصہ ڈالا ہے۔“ احمر نے ایک دن محبت علی سے پوچھا تو اس نے سرد آہ بھری کہنے لگا: ”احمر صاحب! یہ جو نیک بنے پھرتے ہیں نا یہ اندر سے بہت گھٹیا ہوتے ہیں۔ تمھیں پتا ہے یہ صاحب مجھے سلام تک نہیں کرتے، ہاتھ تک نہیں ملاتے۔“ احمر اس کا دکھ سمجھتا تھا اور ”باوضو“ کی نفسیات سے بھی آگاہ تھا کہ وہ مسلکی تعصب اور بغض سے بھرا ہوا تھا۔ محبت علی نے کہا: ”مجھے لوگوں کے رویے پر حیرت ہوتی ہے۔“ احمر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا: ”کیوں؟“ محبت علی نے

آسمان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: "یہ فنڈ میں نے اس لیے بنایا تھا کہ جن کو ایمرجنسی ہو وہ لوگ اس کو استعمال کر سکیں لیکن لوگ اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں کسی کا نام نہیں لیتا لیکن ایک بندہ محض اس لیے ناراض ہو گیا کہ میں نے اسے پیسے نہیں دیے کیونکہ وہ بندہ بیمار بھی نہیں تھا اور پھر بھی اسے پیسے چاہیے تھے۔" احمر نے اسے دلاسہ دیا: "یار! یہ تو ہونا ہی تھا خیر تم دل پہ مت لو۔" بات آئی گئی ہو گئی۔

دوسرا دن تھا، احمر کی طبیعت بہت خراب تھی، اسے الٹی آئی تو اس میں خون کے قطرے تھے۔ وہ دو دن سے دیکھ رہا تھا کہ اسے پیشاب کے قطروں کا رنگ بھی سرخ نظر آتا تھا۔ وہ فطرتاً شرمیلا تھا اس لیے اس نے اس بات کا اظہار کسی سے نہیں کیا اور درد کو کم کرنے والی ادویات لے لیں لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق معاملات بگڑتے چلے گئے۔ پہلے قطرے خون کے آتے تھے، پھر خون تیزی کے ساتھ آنے لگا۔ اس نے ہومیو پیتھک دوائیں لیں۔ فرق نہ پڑا تو حکیموں کی طرف رجوع کیا۔ ان دواؤں نے افاقہ تو نہ کیا البتہ یہ حال ہو گیا کہ رفع حاجت کے بعد اسے یوں لگتا جیسے اس کے جسم میں آگ لگ گئی ہو، درد سے وہ دوہرا ہو جاتا، تڑپتا اور یہ حالت بڑھتے بڑھتے بیں سے بائیں گھٹنوں تک چلی گئی۔ اس کی بیوی، اور دونوں بچے بے بسی کی تصویر بنے اسے دیکھتے رہتے۔ اس نے کمپنی سے پہلے چند دنوں کی چھٹی لی پھر حالت بگڑی، وہ اچھے ڈاکٹروں کے پاس گیا، جمع پونجی خرچ ہوتی گئی۔ اسی دوران ایک حکیم صاحب نے اس کی نبض دیکھی تو وہ پھر حکمت کی دوا لینے لگا۔ کچھ دن آرام رہا لیکن پھر وہی حال، کوئی کہتا بواسیر ہے کوئی کہتا السر ہے غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس کا وزن کم ہونا شروع ہو گیا۔

ایسے ہی ایک دن وہ کام پہ چلا گیا تو سب ہی اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ محبت علی نے بھی اسے دیکھا تو اسے کہا کہ وہ کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھائے۔ علامات سنی تو اس نے اسے مشورے بھی دیے اور کہا کہ وہ کسی سرجن کے پاس جائے۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو وہ فنڈ سے دے گا۔ اس نے دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا کہ اس کی بیٹی بھی بیمار ہے اور ڈاکٹروں نے اس کے اتنے ٹیسٹ کیے ہیں کہ وہ بتا نہیں سکتا۔ اب اس کے پاس اپنا علاج کرانے کے پیسے نہیں اور بیٹی کی بیماری

کی تشخیص تو ہوگئی ہے کہ اسے ''سارکوڈ ائسز'' ہے لیکن اس کی دوا نہیں ہے۔
وہ پھر شہر کے ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے پھر ٹیسٹ، سی ٹی سکین کنٹراسٹ اور کولونوسکوپی کے ساتھ ساتھ اینڈوسکوپی تجویز کر دی۔ ٹیسٹ کا خرچہ تقریباً اسی ہزار کے قریب تھا۔ اس نے محبت علی کو کال کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ڈاکٹر کا نسخہ بھی اسے وٹس ایپ کر دیا۔ اس دن فون پہ اس کی اور محبت علی کی ایک گھنٹہ بات ہوئی جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ وہ کسی سرجن سے مشورہ لے اور جو ٹیسٹ سرجن کہے وہ کرائے پھر جتنا بھی خرچہ ہوگا وہ دے گا۔ وہ چپ ہو گیا۔
اسی دوران ایک ہفتہ گزر گیا۔ درد جب شروع ہوتا تو ماہیِ بے آب کی طرح وہ تڑپتا۔ اس نے درد کی ساری صورتیں اس دوران برداشت کیں۔ یہ جلن، چبھن، ٹیسوں اور نہ جانے کس کس رنگ میں اس پر وارد ہوتا۔ رات کو وہ درد کی شدت سے بے حال ہوتا تو روتا چلاتا، اس دوران وہ اللہ سے باقاعدہ مکالمہ شروع کر دیتا وہ اسے کبھی لاڈ سے مخاطب ہو کر درد میں کمی کے لیے التجا کرتا تو کبھی اسے اس کے محبوب رسولؐ کے واسطے دیتا۔ کبھی اونچی آواز میں درود پاک پڑھنے لگتا تو کبھی قرآن پاک کی کوئی آیت اس کی زبان پہ ہوتی پر درد نہ رُکتا البتہ اس کی توجہ درد سے ہٹ جاتی۔ رات کو اس کی بیوی کی آنکھ کھلتی تو وہ اس کے پاس آ کے بیٹھ جاتی۔ وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی لیکن اسے پتا تھا کہ جسم کے کسی بھی حصے پر ہاتھ لگانا اس وقت اسے مزید درد میں مبتلا کرنا تھا۔ پھر بھی اس کی بیوی نے اور اس کے بچوں نے اس کی خدمت کرنے میں انتہا کر دی۔ وہ شکر کرتا کہ اللہ نے اسے ایسی بیوی دی جو دکھ درد میں اس کی ساتھی ہے۔ اسے خدمت گزار بچے دیئے۔
وہ درد برداشت کرتا رہا، جو ٹیسٹ کم پیسوں والے تھے وہ اس نے کرا لیے، ان میں اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کو اس نے ٹیسٹ دکھائے تو اس نے کہا کہ جلد از جلد کنٹراسٹ سی ٹی سکین کرائے تا کہ بعد میں اینڈو اور کولونوسکوپی کی جا سکے۔ اس نے شام کو محبت علی کو میسج کیا کہ کل اس نے ٹیسٹ کرانے ہیں تو کیا اسے پیسے مل سکتے ہیں تو اس نے مثبت جواب دیا۔ صبح وہ ملازمت پہ چلا گیا۔ اس کا سفید ہوتا چہرہ، ہاتھ میں نمایاں ہوتی رگیں اس کے مسلسل کمزور ہونے کا نوحہ پڑھ رہی تھیں۔ وہ انتظار کرتا رہا لیکن محبت علی سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس نے موبائل نکالا کہ اسے کال کر سکے تو اس

نے وٹس ایپ کھولا، فنڈ والے وٹس ایپ گروپ میں محبت علی کا میسج آیا ہوا تھا وہ دیگر دوستوں سے رائے طلب کر رہا تھا: ”مہربانی فرما کر ایمرجنسی کی تشریح کر دیجیے کیونکہ بعض دوست اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ اسے آسان اقساط پر مشتمل کوئی قرضہ سمجھ بیٹھے ہیں۔“ احمر نے اس میسج کو پڑھا تو زمین آسمان اسے گھومتے دکھائی دیے۔ اس کی ٹانگوں نے اس کے جسم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا ہو گیا: ”کاش وہ مجھے انکار کر دیتا۔“

اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ محبت علی نے نہ تو اسے کال کی نہ ہی میسج۔ اب انتظار فضول تھا۔ اسی دوران موبائل پہ اسے میسج کی ٹون سنائی دی۔ اس نے وٹس ایپ کھولا۔ ایک دوست کا جواب تھا: ”شدید بیماری“ دوسرے دوست کا جواب تھا: ”دواؤں کے مہنگے اخراجات، سرجری، بیماری کی تشخیص کے لیے ضروری جلدی ٹیسٹ، ناگہانی حادثہ۔“ وہ ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں درد تھا۔ وہ دفتر سے نکل آیا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ محبت علی کال آ گئی وہ اسے بلا رہا تھا۔

وہ واپس چلا گیا۔ محبت علی اسے ملا ضرور لیکن احمر کو اس ملنے میں تکلف محسوس ہوا جیسے وہ اسے ملنے میں بھی تکلیف محسوس کر رہا ہو۔ اس کی بات شروع کرنے سے پہلے ہی اس نے بتانا شروع کر دیا۔ ”مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ لوگ ایسے ہی مجھ سے پیسے لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے اپنی گاڑی ٹھیک کرانے کے لیے مجھ سے پیسے لیے، حالانکہ یہ فنڈ اس مقصد کے لیے قائم نہیں کیا گیا۔ اسی طرح دو انتہائی سینئر لوگوں نے ذاتی کاموں کے لیے پیسے لیے۔“ اب وہ اپنے اندر ہمت پیدا کر چکا تھا، اس نے لرزتی آواز میں کہا: ”میں نے آپ کا میسج بھی پڑھا اور ان کا بھی جنھوں نے ایمرجنسی کی تعریف کی اور ایک معیار قائم کیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس تعریف پر اور معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اور ویسے بھی یہ آٹھ دس گھنٹوں کا شدید درد میں جھیل سکتا ہوں۔“ محبت علی نے کہا: ”تم ڈاکٹر کے پاس جاؤ، اگر وہ ٹیسٹ لکھ دے تو ٹیسٹ کراؤ، میں پیسے دوں گا۔“ احمر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چھلکتی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے جیب سے ڈاکٹر کی پرچی نکالی جس پر اس نے سی ٹی سکین اور دوسرے ٹیسٹ لکھے تھے۔ اس نے نگاہ بھر کر پرچی کو دیکھا اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے: ”یہ آٹھ دس گھنٹے کا شدید درد تو میں برداشت کر سکتا ہوں۔۔۔“

☆☆☆☆☆

خاموش اعتراف

رات گہرے سناٹے کا لبادہ اوڑھے دھندلی چاندنی کو کھڑکی کے راستے سے کمرے میں بکھیر رہی تھی۔ میز پر پڑی پرانی ڈائری کے اوراق بھی ساکن ساکن سے تھے۔ یہ اوراق یوں لگ رہا تھا جیسے اپنی زندگی کھوتے جا رہے تھے۔ کمرے میں زائرہ کرسی پر براجمان اس ڈائری پر ہاتھ رکھے ڈائری کی طرح ہی ساکن تھی۔ اس کے سامنے کرسی پر شہزاد بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں خاموش تھے لیکن آنکھوں میں بے شمار سوال چمک رہے تھے۔ دونوں میاں، بیوی تھے۔ ان کا برسوں کا ساتھ تھا۔ ان کے درمیان ایک چھوٹی سی چپقلش نے نہ ٹوٹنے والی دیوار قائم کر دی تھی۔ دونوں میں کوئی بھی پہل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ہمت دونوں میں تھی۔ آخر زائرہ نے ڈائری پر چند الفاظ لکھ کر ڈائری شہزاد کی جانب بڑھا دی۔

شہزاد نے ڈائری دیکھی۔ اس پر رقم تھا:

"ذرا سی چپقلش نے کیا میری محبتوں پر پانی پھیر دیا ہے؟ میں تمھارے پاس ہو کر بھی تمھیں ترستی ہوں"۔ شہزاد کی پلکیں لرز اٹھیں۔ اس نے بھی ڈائری پر کچھ لکھا اور ڈائری زائرہ کی جانب بڑھا دی۔

"میری زہر زہر ہوتی رگوں میں آج اطمینان اترا ہے"۔ شہزاد کے اس خاموش اعتراف نے زائرہ کے جسم جیسے نئی روح پھونک دی۔ اس کی نظریں چمک اٹھیں۔ شہزاد نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو زائرہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ کیوں کہ وہ یہ حق اپنے نام محفوظ رکھتی تھی۔ دونوں نے اس خاموش اعتراف پر چاندنی نے رات روشن کرنا شروع کر دی۔ ہوا نے دھیرے دھیرے گنگنا کر اس خاموش اعتراف پر جیسے مہر ثبت کر دی۔

☆☆☆☆☆

بابر امین ابر

ہنسوڑا

محمد علی نجیب

ساجد خوش مزاج اور انسان دوست لڑکا تھا ہروقت کھلنڈرے مزاج میں رہتا۔ آنکھیں بڑی بھوری، چوڑا چہرہ جبکہ رنگ صاف تھا۔ ساجد کی تھوڑی اس کے منہ سے کچھ آگے نکلی تھی جو اس کی شخصیت کو مزید رنگیلا بناتی۔ محلے کے دوستوں میں باہمی مزاق کی وجہ سے ساجد ہنستا یا لڑکوں کے جھگڑا میں اسے کبھی مار پڑ جاتی، وہ روتا تو اس کا چہرہ پچکی ہوئی ''ب'' سا بن جاتا۔ یوں پاس موجود تمام لوگ اسے دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہنستے چلے جاتے۔ اس بارونق مزاج اور شکل کی وجہ سے ہی تو وہ محلے کی آنکھ کا تارا تھا۔ ساجد شہر کے جس گنجان محلے میں رہتا تھا اس کی گلیاں بہت تنگ بھی نہ تھیں، مگر ان گلیوں میں یگانگت کی خوشبو بکھری رہتی جو وہاں رہنے والے لوگوں کے دلوں کی وسعت کی عکاسی کرتی تھیں۔ اس محلے میں ہر گھر کی چھت پر محبت کی چادر تنی رہتی۔ ہر شام کو بچے گلیوں میں کھیلتے، جبکہ بزرگ احباب گلی کے چوراہے پر بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے ۔ جوان دوست اپنے مسائل اور خوشیوں کو بانٹنے کے لیے ایک جگہ محفل جماتے، چاہے وہ پتنگ بازی ہو، عید کی خوشیاں ہوں یا کسی کی سالگرہ۔ یوں

محلے کے لوگ ایک دوسرے کے لیے ہر وقت حاضر رہتے۔
مگر محلے کی گلی آج کچھ سنسان سی تھی۔ بچے جو اکثر سکول سے واپس آنے کے بعد گلی میں شور مچاتے، آج چپ چاپ اپنے گھروں میں بیٹھے تھے۔ دکانوں پر گاہک بھی کم تھے اور دیواروں پر لگے پوسٹر بھی وہاں کے لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کر رہے تھے۔
خبر پھیل چکی تھی — جگنو جو کے ساجد کے بچپن کا دوست تھا، آج اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ساجد کندھے پر سفید صافا رکھتے ہوئے اپنی والدہ کے ساتھ جگنو کے گھر کی جانب نکلا۔ اس کی ماں نے بھی سفید دوپٹہ کندھے پر اوڑھ لیا۔ ساجد کو سینے میں ایک عجیب سا خالی پن محسوس ہو رہا تھا۔ بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں تیرنے لگیں، وہ دن جب جگنو کے والد نے دونوں کی سائیکلوں کو چند لمحوں میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ کہتے ہوئے صاف کر دیا تھا کہ لڑکو صاف سواری ہو تو شخصیت بھی نکھری لگتی ہے۔ مگر اب وہ گرمجوشی، شفقت بس یاد بن کر رہ گئی تھی۔
چند لمحوں میں وہ جگنو کے گھر جو کے گلی کے نکڑ پر تھا پہنچ گئے جہاں اور محلے دار بھی جمع تھے۔ کچھ گھر کی دیوار کے سہارے بیٹھے تھے اور کچھ خاموشی اور اداسی سے گھر کے باہر گلی میں کھڑے تھے۔ خواتین جگنو کے گھر کے ایک کمرے میں جمع تھیں۔ وہاں وقت رک سا گیا تھا۔
ساجد اور اس کی ماں گھر کے اندر گئے جہاں جگنو ایک کونے میں آنکھوں میں بے بسی لیے بیٹھا تھا۔ ساجد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا جبکہ اس کی والدہ نے نرمی سے جگنو کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا، ”اللہ تمھارے والد کو جنت میں جگہ دے اور تمھیں صبر دے۔“ یہ سنتے ہوئے جگنو کی آنکھوں سے پانی کی ایک خاموش بوند نیچے گر پڑی۔ گھر کے بزرگوں نے ماضی کی یادیں تازہ کرنا شروع کیں۔ جگنو کے والد کے قصے سن کر محفل میں ایک ملائم سی مسکان نمودار ہوئی، لیکن وہ مسکان رنج و غم میں لپٹی ہوئی تھی۔ ساجد کے لیے یہ منظر دکھ اور سکون کا ملا جلا احساس تھا۔ یار جگنو چاچے کا چہرہ تو دکھا دے۔ ساجد جو جگنو کے والد کو چاچا کہتا تھا نے روہانسا ہوتے ہوئے ساجد کو کہا۔ جگنو یہ سنتے ہوئے ساجد اور اس کی والدہ کو گھر کے اندر کمرے میں لے گیا جہاں میت رکھی تھی۔ کمرہ تھوڑا بڑا تھا اور محلے کی چند عورتیں اور ان کے نوعمر بچے جگنو کی والدہ اور میت کے گرد جمع تھے۔ ساجد کو دیکھتے ہی بچے آپس میں کھس پھس کرنے لگے۔ جبکہ ساجد کی والدہ نے آگے بڑھ کر دلاسا دیتے ہوئے جگنو کی روتی ہوئی والدہ کو گلے لگایا۔ ساجد بھی جگنو کے والد کو پکارتا روتا میت کی جانب بڑھا۔ چاچا او چاچا! کیوں ہمیں اتنی جلدی چھوڑ کر چلا

گیا۔ ایسا کہتے جیسے ہی ساجد نے رونا شروع کیا تو اس کا منہ "پ" کی طرح بنتا چلا گیا اور کمرے میں موجود بچے ہنس پڑے۔ جگنو اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے تذبذب کا شکار ہوا جبکہ بچوں کی ماؤں نے بھی انھیں اس حرکت پر جھاڑ پلائی۔ مگر بچے کہاں باز آنے والے تھے۔ ڈانٹ کی آواز سن کر ساجد نے روتے ہوئے جیسے ہی پلٹ کر ماؤں کو بچوں کو ڈانٹنے سے منع کیا، بچے پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے جو ساجد کو بغور دیکھے جا رہے تھے۔ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ساجد نے رونے اور خاموشی سے میت کے پاس سے اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک ساجد کو کمرے کے کونے میں چپ کھڑا دیکھ کر دو بچے جن کے چہرے پر شرارت عیاں تھی، اس کی طرف بڑھ کر کہنے لگے۔ ساجد بھائی، تھوڑا رو کر تو دکھاؤ۔ ساجد نے جواباً روہانسا چہرہ بناتے ہوئے انھیں کہا۔ جاؤ بچو! تنگ نہ کرو، یہاں سے چلے جاؤ۔ مگر ساجد کو دیکھتے تمام بچے پھر ہنسنا شروع ہو گئے۔

جگنو نے حالات کو بھانپتے ہوئے ساجد کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ساجد تیرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کمرے کا ماحول بدل جاتا ہے تو ایسا کر کہ باہر گلی میں مردوں کے ساتھ جا کر بیٹھ جا۔ ساجد نے جگنو کی بات سمجھتے ہوئے ثبات میں سر ہلایا اور روہانسا سا منہ بناتے ہوئے کمرے سے باہر جانے لگا۔

کمرے میں موجود کچھ درمیانی عمر کی خواتین ساجد کے چہرے کو دیکھ کر اپنے دوپٹوں سے منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔ جتنے بھی چھوٹے بچے تھے وہ بھی ساجد کے ساتھ باہر ہو لیے۔ اب ساجد مردوں میں تھوڑا ڈرا بیٹھا ہوا تھا۔ تمام چھوٹے بچے اس کے پیچھے آ کر جو کھڑے ہو گئے تھے۔

مردوں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص ساجد سے افسوس کرنے لگا۔ بیٹا ساجد بہت دکھ ہوا تمھارے دوست جگنو کے والد کی وفات کا۔۔ تمھارا تو بڑا پیار تھا ان سب گھر والوں سے۔ جی بزرگو! بس جو اللہ کی مرضی۔ بہت جلدی چلے گئے چاچا جی۔ ایسا کہتے جیسے ہی ساجد بے دھیانی میں رونے لگا اس کے پیچھے موجود تمام بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس مرتبہ کچھ بڑے بزرگوں نے بھی بچوں کو ڈانٹا اور وہاں سے جانے کا کہا، مگر بچے ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔۔ جگنو جو دور کھڑا یہ سب صورتحال دیکھ رہا تھا، ساجد کی جانب بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ یار ساجد برا نہ منانا پر تو ابھی گھر چلا جا۔ تیری طرف سے افسوس ہو گیا۔ یہاں کا ماحول تیری وجہ سے بگڑ جاتا ہے۔ جگنو کی بات سمجھتے ہوئے ساجد نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور اپنی ماں کے بغیر ہی گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ساجد گھر پہنچ تو گیا مگر اضطرابی سوچوں نے اسے مزید بے چین کر دیا۔ وہ بڑبڑانے لگا، یہ میری وجہ سے ان کی

فوتگی پر کیا ہو گیا۔ مگر نماز جنازہ پر جانا لازمی ہے۔ ورنہ ساری زندگی پچھتاتا رہوں گا۔ یہ سوچتے ہوئے ساجد نے جگنو کو موبائل پر فون کیا۔ جگنو کے فون اٹھاتے ہی ساجد بولا۔ یار جگنو، تمھارے کہنے پر میں وہاں سے آ تو گیا ہوں۔ مگر چاچا کی نماز جنازہ میں نے لازمی پڑھنی ہے، تو جیسے ہی جنازہ اٹھانے لگو مجھے فون کر دینا۔ ساجد کی بات کا جگنو نے مثبت جواب دیتے ہوئے جنازہ اٹھانے کا وقت بتایا اور مقررہ وقت پر ساجد کو اس کے گھر پہنچنے کا کہا۔ متعین وقت پر ساجد جنازے کو کندھا دینے جگنو کے گھر پہنچا مگر اب احتیاطاً ساجد نے سفید کپڑا اپنے منہ پر لپیٹ رکھا تھا۔ جنازگاہ جگنو کے گھر سے تین چار گلیاں چھوڑ کے تھی۔ ساجد اور دوسرے محلے دار جنازے کے لیے چارپائی اٹھائے جنازگاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ دوسری گلی میں جیسے ہی ساجد نے جنازے کو کاندھا دینے کے لیے چارپائی پکڑی، تو اس کے منہ پر سے کپڑا سرک گیا۔ جنازے کے ساتھ چلتے بچے شاید اسی موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ساجد کو دیکھتے ہوئے اس کے آگے پیچھے چلنے لگے، کوئی بچہ اس کو رونے کا اشارہ کر رہا تھا اور کوئی اسے دیکھتے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس صورتحال کو بھانپ کر جگنو نے آگے بڑھتے اپنے والد کے جنازے کی چارپائی کا پایا ساجد سے لیتے ہوئے اسے پیچھے آتے لوگوں میں جانے کا کہا۔ اس مرتبہ ساجد نے جنازے کے ساتھ چلتے بچوں کو خود سختی سے ڈانٹا اور جنازے میں پیچھے آتے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ بچے ساجد سے ڈانٹ پڑنے کے بعد بکھر گئے۔ جگنو کے والد کو دفنانے سے لے کر واپس اس کے گھر آ کر کھانا کھانے تک، تمام موجود محلے دار ساجد کو دلاسا دیتے رہے اور بچوں کی حرکتوں کو ان کی شرارتیں بتا کر ساجد کی ڈھارس بندھاتے رہے۔ اتنے میں جگنو بھی محلے داروں میں آ کر بیٹھ گیا۔ تمام محلے دار اس کی طرف متوجہ ہو کر تسلیاں دینے لگے اور ضرورت پڑنے پر بہر صورت اس کے کام آنے کا یقین دلاتے رہے۔ ایسی باتیں سنتے ساجد نے بھی جگنو کا ہاتھ تھام لیا جو کہ جگنو کو ایک علامت تسلی تھی، کہ زندگی اپنے مکمل انداز میں آگے بڑھے گی مگر صبر اور حوصلہ ہی فی الوقت مشکل لمحوں کو گزار سکتا ہے۔ محلے داروں کے دلاسے جگنو کے لیے اطمینان کا باعث بنے۔ تمام لوگوں کی باتیں سنتے جگنو نے ساجد کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ او ہنسوڑے! تمھاری مہربانی کہ مشکل وقت میں میرے ساتھ ہو مگر فوتگی خراب کرنے میں تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جگنو کے پر اطمینان لہجے سے اپنا نیا نام سن کر ساجد کو اب جگنو کی تسکین کا اندازہ ہوا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ ساجد کے چہرے پر ابھر آئی۔

☆☆☆☆☆

قاری اور "نام نہاد فین"

"ارشد جمال بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میں نے ان کی کئی تحریریں پڑھی ہیں۔ ہلکے پھلکے اور سادہ انداز بیاں کے ساتھ لکھی تحریریں، جو عام قاری کو سمجھ آسکے"۔ یہ نمرہ تھی۔ جو معروف ناول نگار ارشد جمال کے بارے میں اپنی دوست ثمرہ کو بتا رہی تھی۔ جو اکثر ڈائجسٹ پڑھنے سے چڑ جاتی تھی۔

"اچھا اب جلدی چلو۔ اردو کی کلاس شروع ہونے والی ہے"۔ ثمرہ نے اس کی بات کا نوٹس لیے بغیر کہا۔ دونوں اردو کی پروفیسر کے کلاس روم میں آنے سے پہلے چیئرز پر بیٹھ چکی تھیں۔

ثمرہ کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی شوق تھا۔ اس کی متعدد کہانیاں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی تھیں۔

اگلے روز وہ کالج سے گھر پہنچی تو بہت تھک چکی تھی۔ کالج کی ادبی سوسائٹی کا خاص اجلاس تھا۔ جس میں نمرہ نے بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ شام تک اس کی توانائی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ تھکاوٹ اور نیند کے غلبے کی وجہ سے آنکھ لگ گئی۔ شام 5 بجے اٹھی تو سر میں ہلکا درد تھا۔ جلدی سے کچن میں گئی۔ چائے بنائی اور اپنی رائٹنگ ٹیبل پر آ بیٹھی۔ اچانک اس کی نظر سامنے میز پر موجود پیکٹ پر پڑی۔

"ارے یہ کیا۔ میرا ڈائجسٹ آیا ہوا ہے اور مجھے پتا ہی نہیں"۔ یہ سوچتے ہوئے وہ کمرے سے باہر آئی اور امی کو آواز دی۔

"امی ڈاک سے میرا رسالہ آیا ہوا ہے اور مجھے کیوں نہیں بتایا؟"۔

"بیٹا میں نے سوچا تم ریسٹ کرلو۔ رسالہ کون سا بھاگا جا رہا تھا۔ ویسے بھی آج تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی" امی نے پیار سے کہا۔

رانا محمد شاہد

''امی آپ بھی نا''۔ یہ کہہ کر اس نے جلدی سے لفافے سے رسالہ نکالا۔ اس کی مخصوص خوشبو کو سونگھ اور بے تابی سے فہرست پر نظر دوڑائی۔

''ارے میری کہانی۔۔۔ یاہو''۔ خوشی کی تیز آواز سے وہ گویا جھوم اٹھی۔

فہرست میں اس کی کہانی کا عنوان جلی حروف میں لکھا تھا۔

''ادھوری ڈائری کا ایک ورق''۔

''ارے واہ۔ اس مہینے بھی نمرہ کی کہانی چھپی ہے''۔ اس کی امی بھی بیٹی کی خوشی میں خوش تھیں۔

''اس بار کیا بناؤں اپنی بیٹی کے لیے۔ تم نے کہا تھا اس بار جب کہانی چھپے گی تو تمھارے پسندیدہ کریلے گوشت بنیں گے؟

''جی امی بنا لیجیے گا۔ میں ابھی ثمرہ کو کال کرتی ہوں''۔ نمرہ نے ایک خیال کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جب بھی کہانی چھپتی ثمرہ کو لازمی بتاتی۔ جیسے یہ دونوں کے مشترکہ مشن کی کامیابی ہو۔

اس نے ثمرہ کا نمبر ملایا۔ ابھی رنگ جا رہی تھی کہ اس دوران خوشی کی ایک چیخ اس کے منہ سے برآمد ہوئی۔

''اونو۔۔۔ سر ارشد جمال کے ساتھ''۔

''تمھارے پسندیدہ رائٹر ارشد جمال کو کیا ہوا ہے اور یہ کس طرح کی خوشی ہے''۔ نمرہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ کال دوسری طرف ریسیو ہو چکی ہے۔

''کچھ نہیں ثمرہ۔ آج میں کتنی خوش ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں''۔

''یقیناً ڈائجسٹ میں کہانی چھپی ہے۔ مبارک ہو۔ مجھے پتا تھا۔ تمھاری خوشی کا دائرہ اسی کے گرد گھومتا ہے''۔

''جی صرف کہانی نہیں چھپی۔ سر ارشد جمال کی کہانی کے ساتھ میری کہانی۔ اپنے پسندیدہ رائٹر کے ساتھ اپنی کہانی۔ اس سے بڑی خوشی کیا ہو گی''۔ نمرہ کی خوشی اس کے جوش سے جھلک رہی تھی۔

''بھئی واقعی کہانیاں تو تمھاری پہلے بھی چھپی ہیں مگر ارشد جمال کے ساتھ کہانی کا چھپنا۔۔۔ یہ تو بڑا اعزاز ہے۔ اب یہ بتاؤ کس ریسٹورنٹ میں ٹریٹ دو گی''۔

''جس میں تم کہو۔ کل ہی ''زارا کچن'' چلتے ہیں۔ ویسے بھی تم کافی دنوں سے وہاں کھانے کا کہہ رہی تھی''۔ نمرہ کی کی کہانی

چھپتی تو وہ اس خوشی کو گھر میں اہتمام سے مناتی۔ گھر میں کوئی چیز بنالیتی یا آن لائن آرڈر ہوتا۔ مگر اس دفعہ خوشی انوکھی تھی تو اہتمام بھی۔

نمرہ اچھا لکھتی تھی۔ مگر مستقل مزاج نہ ہونے کی وجہ سے اس کا مطالعہ محدود تھا۔ وہ اپنی اس خامی پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر نئے لکھنے والے کے اندر ایک عجیب بے چینی ہوتی ہے۔ وہ اپنی لکھی ہر کہانی چھپوانا چاہتا ہے۔ نمرہ کی نفسیات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

دو دن بعد شہر کی معروف لائبریری میں کئی بڑے ادیبوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک تقریب منعقد ہوئی۔

جس میں شہریوں کی بھی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ نمرہ کو اس ادبی ماحول میں بیٹھ کر یوں لگا، جیسے وہ علم کے سمندر کے کنارے آبیٹھی ہو۔ اس دوران اس کی نظر ارشد جمال پر پڑی۔ وہ ایک کونے میں کھڑے کسی سے محو گفتگو تھے۔ نمرہ نے بے تابی سے ثمرہ کا ہاتھ چھوڑا اور فوراً ان کے پاس پہنچی۔

''سر آپ میرے پسندیدہ ترین لکھاری ہیں۔ میں آپ کی بہت بڑی قاری ہوں''۔ نمرہ نے انتہائی جوش سے روایتی جملے بولے۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی چمک تھی، جو ایک سچے مداح کے چہرے پر ہوتی ہے۔

''سر میں آپ کی بہت بڑی قاری ہوں۔ آپ کے ناولز اور افسانے پڑھ رکھے ہیں''۔ نمرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ارشد جمال سے کیا کیا کہہ دے۔

''وری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے''۔ ارشد جمال مسکراتے ہوئے بولے اور پھر اگلے ہی لمحے ان کی آنکھوں میں ایک پرکھنے والی چمک آئی۔ انھوں نے نمرہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور ایک ایسا سوال پوچھا، جو اس کے لیے غیر متوقع امتحان بن گیا۔ ''اچھا تو آپ کو میرا کون سا ناول اور کون سا افسانہ زیادہ پسند ہے؟''

نمرہ کو احساس ہوا کہ اس نے فین ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے۔ وہ کتنا کھوکھلا ہے۔ اس نے ارشد جمال کے ایک، دو افسانوں کے علاوہ کچھ نہیں پڑھا تھا اور ان افسانوں کے نام بھی اس کے ذہن میں نہیں تھے۔

''وہ سر جس میں آپ نے ایک معروف رائٹر

اور اس کے نام نہاد فین کا ذکر کیا ہے"۔

"ارے واہ آپ کو تو یاد ہے۔ اس میں بھلا کیا پیغام چھوڑا تھا میں نے۔ مرکزی خیال کیا تھا، بتا سکتی ہیں"۔ ارشد جمال نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ بھی نہیں بتا سکی۔ ارشد جمال کا سوال ہی ایسا تھا جس کا جواب صرف وہی دے سکتا تھا، جس نے افسانہ غور سے پڑھا ہو۔ ارشد جمال سمجھ چکے تھے کہ ان کا لکھا یہ افسانہ حقیقی روپ میں ان کے سامنے کھڑا ہے۔

"اگر آپ میری بہت بڑی فین ہیں تو آپ کو بتا تا چلوں کہ وہ افسانہ آپ کے لیے ہی لکھا گیا ہے۔ آپ نے اسے ضرور پڑھنا ہے"۔ ارشد جمال نے کہا تو نمرہ کو لگا شاید وہ پکڑی نہیں گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی حقیقت آشکار ہو گئی۔

"سر میں مختلف رسائل و جرائد میں لکھتی ہوں۔ مجھے کچھ بتائیے کہ میں مزید بہتر کیسے لکھ سکتی ہوں"۔ اس نے ارشد جمال سے پوچھا تو انھوں نے ایک لمبا سانس لیا اور دوٹوک انداز میں بولے۔

"آپ کو صرف یہ افسانہ غور سے پڑھنا ہے۔ آپ کے سبھی سوالوں کا جواب اس افسانے میں موجود ہے"۔

اب اسے یقین ہو چکی تھا کہ ارشد جمال اس کے سطحی مطالعہ اور جھوٹی تعریف کی حقیقت کو جان چکے ہیں۔ اس دوران تقریب کا آغاز ہو گیا۔

گھر آ کر اس نے پہلی فرصت میں وہ افسانہ پڑھا۔ "نام نہاد فین" ایک ایسے نوجوان مصنف کے بارے میں تھا۔ جو معمولی شہرت کے بعد خود کو بڑا ادیب سمجھنے لگتا ہے۔ مطالعہ ترک کر دیتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی تعریفیں سن کر خوش ہوتا ہے مگر جب کوئی نقاد یا سینئر لکھنے والا کسی موضوع پر رائے مانگتا ہے تو وہ لاجواب ہو جاتا ہے۔ افسانے میں نئے لکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ مطالعہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ افسانے کا واضح پیغام تھا کہ اگر آپ لکھاری بننا چاہتے ہیں تو ہر طرح کی تحریروں کا مطالعہ کریں۔ تحریر کا معیار آپ کی پڑھی کتابوں سے جھلکتا ہے۔ اور اگر آپ کسی بڑے مصنف کے فین ہیں تو اس کی تحریروں کو پڑھ کر یہ ثابت بھی کیجیے۔ ورنہ پکڑے جانے کی صورت میں شرمندگی ہی ہاتھ آئے گی۔ نمرہ کو اپنی اس کمی کا ادراک آج ہوا تھا۔ اس نے اپنی رائٹنگ ٹیبل پر پڑی غیر مطبوعہ کہانیوں کو دراز میں رکھا اور فیصلہ کیا کہ اب وہ کوئی نئی کہانی نہیں لکھے گی۔ صرف مطالعہ کرے گی۔

☆☆☆☆☆

پھٹی ایڑیاں

محبت اکثر آنکھوں سے شروع ہوتی ہے اور آنکھوں سے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر کچھ محبتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو آنکھوں سے دل تک آتی ہیں، اور پھر وہیں ٹھہر جاتی ہیں۔

میں اُسے روز دیکھتا تھا۔ وہ کالج آتی، سیاہ عبایا میں لپٹی، مگر میرے لیے وہ ہر رنگ میں رنگی ہوئی لگتی۔ میں اُس کے جوتے دیکھتا، گھڑی نوٹ کرتا، بیگ کا رنگ پہچانتا اور اکثر یہ سب اُسے لفظ بہ لفظ سنا بھی دیتا۔

وہ ہنستی، حیران ہوتی، اور کہتی، "تمھیں سب یاد رہتا ہے؟"

اور میں فخر سے مسکرا دیتا۔ ہاں! محبت میں یہی تو ہوتا ہے۔

کبھی میں اُسے گلہ بھی کر دیتا، "اب تم بتاؤ، میں نے کیا پہنا تھا؟" تو وہ شرمیلی سی کہتی، "تمھیں دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔" اور میں جانتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے، مگر اپنے جذبے کا اظہار نہیں کر پاتی۔ وہ بس میری طرف ایک محبت بھری، شرمیلی نگاہ ڈالا کرتی تھی، اور جب میں اسے دیکھتا، وہ آنکھیں نیچی کر کے مسکرا دیتی تھی۔

اگلے دن میں نے اسے کہا کہ آج تم نے بتانا ہے کہ میں نے کیا پہنا تھا اور کیسا لگ رہا تھا۔۔؟

راہ گزر سے وہ اپنی کلاس کی طرف جا رہی تھی اور میں اس کے سامنے سے گزرتا کہ اس کو دیکھنے میں مدد ہو، کلاس ختم ہوئی، دونوں گھروں کو روانہ ہوئے، اور کال پر میں نے اس سے پوچھ لیا "تو بتاؤ پھر آج میں کیسا لگ رہا تھا، اور میں نے کیا پہنا ہوا تھا۔۔؟"

مگر اُس دن..... اُس دن اُس نے وہ کہا جو نہ جملہ تھا، نہ شکایت۔ بل کہ شاید سب سے اونچا اعتراف محبت۔

اُس نے کہا:

"تمہاری ایڑیاں پھٹی ہوئی ہیں، تم ان پر ویسلین لگایا کرو۔"

اُس لمحے میں چپ ہو گیا۔ آنکھوں نے دل کی بات سُن لی۔

یہ وہ جملہ تھا جو محبت کے سب دعوؤں سے بڑا تھا۔ کیونکہ اب وہ صرف میرے رنگ، میرے کپڑے، میرے جوتے نہیں دیکھ رہی تھی۔

بل کہ مجھے دیکھ رہی تھی... مکمل، سچا، ویسا جیسا میں تھا۔

اُس دن مجھے یقین ہوا کہ جب عورت محبت کرتی ہے، تو وہ تمہیں تم سے زیادہ جان لیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ثقلین مرزا

غزل

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

شہر میں کون دن نکلنے کا
رات بھر انتظار کرتا ہے

کس گلی سے گزر کے گھر جائیں
دن یہاں دن ڈھلے اُترتا ہے

کوبکو رنگ ، سو بسو رم جھم
کن رتوں کی وہ بات ہے

کون تارِ سکوت سے دم دم
گیت کے روپ میں ابھرتا ہے

ہات اس کا ہوا کے ہاتھ میں ہے
کب وہ پاؤں زمیں پہ دھرتا ہے

ساتھ چلتے ہیں گرد کے بادل
جس طرف سے بھی وہ گزرتا ہے

سانس لیتا ہے سسکیوں کی طرح
وہ بھی اب دم ہوا کا بھرتا ہے

دھوپ کی طرح بھوک برسے گی
دل نے بھی ایک قحط برتا ہے

کس کی دستار کس کے پاؤں میں ہو
دل سبھی جمگھٹوں سے ڈرتا ہے

انتشار آشنا ، زوالِ اساس
پھول کھلتا نہیں ، بکھرتا ہے

حالِ دل کس طرح کہوں خالد
وہ مرا احترام کرتا ہے

خالد احمد

غزل

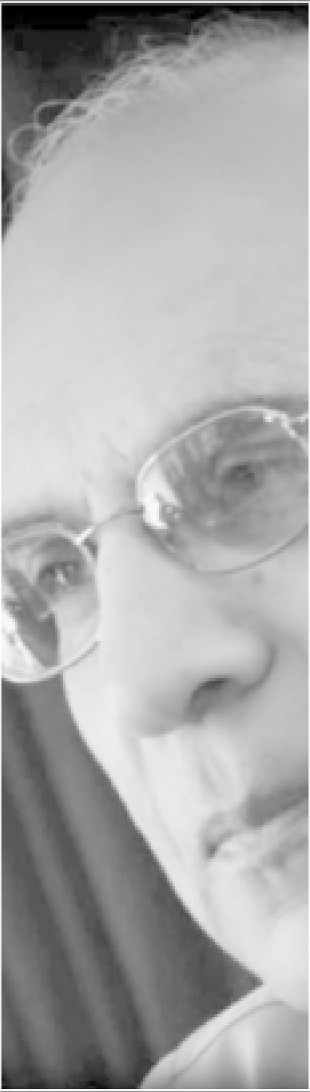

یہی نہیں کہ اُجڑتے بجھاتا گیا میں
دلوں طرف نئے رستے نکالتا گیا میں

جنوں نہ کم کبھی اندر کے حیرتی کا ہوا
جواب آئے نہ آئے سوالتا گیا میں

یہ لگ رہا ہے عدو چھیڑ کر رہے گا وہ جنگ
کسی طرح جسے برسوں سے ٹالتا گیا میں

کرم یہ کم تو نہیں ہے مرے ستم گر کا
کہ غم دیے گیا وہ، دل اُجالتا گیا میں

کچھ اس قدر تھا بلاوے کے انتظار میں دل
اچھلتا، جھومتا نکلا، دھمالتا گیا میں

دراز ہوتی گئیں کج کلامیاں اُن کی
غزل غزل سخن اپنا جمالتا گیا میں

نکالتا گیا عالی نواح ویسے نقوش
کسی کی یاد میں جیسے خیالتا گیا میں

جلیل عالی

غزل

ظلم سے بیر ہے، ظالم کی پذیرائی ہے
ہر کوئی شہرِ تماشا میں تماشائی ہے

ہم جو زندہ ہیں تو بڑھتے ہوئے قدموں کے طفیل
لوگ کہتے رہے پسپائی میں دانائی ہے

شب کا مفہوم سمجھتا ہوں مگر یاد رہے
ان اندھیروں سے شناسا مری بینائی ہے

اپنی وحشت سے ڈراتے ہو تمھیں کیا معلوم
قوتِ حرف مری تاب و توانائی ہے

اک حسیں خواب کو تعبیر کریں گے اک دن
ہم نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے

اس کو خوش آتی نہیں نقرئی گل دان کی قید
یہ تو صحرا میں کھلا تھا گلِ صحرائی ہے

اے مرے مالک و مختار ترے ہوتے ہوئے
اتنے مجبور ہیں در در پہ جبیں سائی ہے

لوٹ آیا ہوں خیالوں کی حسیں دنیا سے
پھر وہی لوگ، وہی میں، وہی تنہائی ہے

جیت اور ہار کے مابین گزرتے ہوئے دن
زندگی کیا ہے کنور معرکہ آرائی ہے

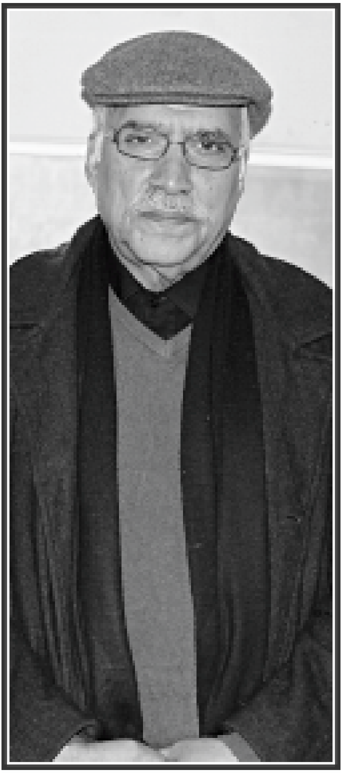

اعجاز کنور راجہ

غزل

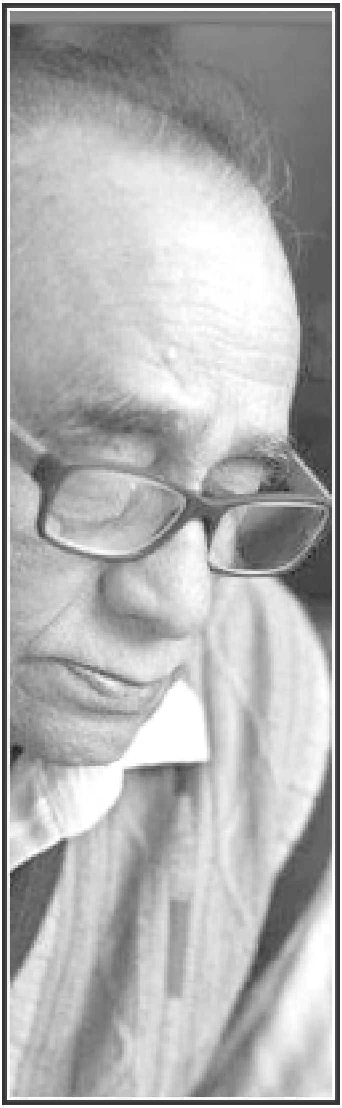

بھرے گھر میں بھی ہم عزلت گزیں ہیں
بس اپنے آپ میں گوشہ نشیں ہیں

کسے پروا ہمارے نیک و بد کی
خود اپنے معترف، خود نکتہ چیں ہیں

توجہ کیا کسی جانب ہو مرکوز
دماغ و دل کہیں ہیں، ہم کہیں ہیں

یہ بازو آہنیں ہیں لیکن اِن میں
وہ گل اندام ہو تو مخملیں ہیں

نہ ہم فرہاد یا مجنوں کہیں کے
نہ وہ ایسے حسین و نازنیں ہیں

مکیں ہوتے تھے زیرِ آسماں ہم
سو اب آرام سے زیرِ زمیں ہیں

ترے دل سے نکلتے ہی نہیں شک
شعور آخر یہ شک ہیں یا یقیں ہیں

انور شعور

غزلیں

رہنے لگا ہوں رنگِ جہاں دیکھتا ہُوا
آیا تھا لامکاں سے مکاں دیکھتا ہُوا

عُجلت میں اُس کو مَیں بھی نہیں دیکھ پایا ہُوں
گزرا ہے وہ بھی جانے کہاں دیکھتا ہُوا

پہنچے گا ہم تلک بھی کبھی ناقدِ ادب
میر و اسد کا حسنِ بیاں دیکھتا ہُوا

دریا کنارے صدیوں سے بیٹھا ہُوا پہاڑ
پتھرا گیا ہے آبِ رواں دیکھتا ہُوا

سویا ہُوا ہُوں مٹی کی بوجھل تہوں تلے
اُٹھوں گا کوئی خوابِ گراں دیکھتا ہُوا

مَیں کوئی یادگارِ زمانہ ہُوں غالباً
گزرے ہے جس کو خرد و کلاں دیکھتا ہُوا

خاور اعجاز

اِک وقت تھا کہ ہوتے تھے دونوں جہاں قریب
اَب یہ زمیں قریب نہ وہ آسماں قریب

مدھم سی ہو گئی ہے نگاہوں کی روشنی
شاید کہ آ چکی ہے شبِ امتحاں قریب

سیرِ چمن کا شوق کہاں لے کے آ گیا
کُنجِ قفس رہا نہ کوئی آشیاں قریب

سب رفتنی ہیں، جائیں گے سب اپنی اپنی راہ
جس کو پڑے گی منزلِ آخر جہاں قریب

کوئی سمجھ سکا نہ دمِ نزع میری بات
بیٹھے ہُوئے تھے گرچہ مِرے ہم زباں قریب

اے شیخ و برہمن! کہاں لے آئے بحث میں
راہِ خدا ہے پاس نہ راہِ بتاں قریب

آنے لگی ہے بانگِ درا ہو کے تیز تر
خاورؔ پہنچ گیا ہے تِرا کارواں قریب

غزل

یہ سبھی کہنہ روایات نہیں مانتا میں
دِن کو دِن، رات کو اب رات نہیں مانتا میں

کوئی تحدید سفر میں نہیں منظور مجھے
سرحدِ ارض و سماوات نہیں مانتا میں

اِس قدر اُس کی محبت کا ہے غلبہ مجھ پر
اب تو اپنی بھی کوئی بات نہیں مانتا میں!

روز کچھ اَور دگرگوں ہی ہوئے جاتے ہیں
کبھی سدھریں گے یہ حالات، نہیں مانتا میں

اَور اِک معرکہ تیار ہے میرے اندر
ہوگئی مُجھ سے مجھے مات، نہیں مانتا میں!

بارشِ سنگ بھی ہر اِک کے مقدر میں کہاں؟
کیوں اِسے طرزِ مُدارات نہیں مانتا میں!

غم جو آنکھوں میں مکیں رہتا ہے پانی بن کر
کیوں اِسے موسمِ برسات نہیں مانتا میں

عشق نے مسئلے حل کر دیئے سارے میرے
کیوں اسے قبلۂ حاجات نہیں مانتا میں

جو ہے موجود، وہ اعلان بھی ہونے کا کرے
نفی سے ہوتا ہے اثبات، نہیں مانتا میں

سلسلہ جن کا نہ اُسؔ در سے کہیں ملتا ہو
معجزے ہوں یا کرامات، نہیں مانتا میں

دل پہ جو اَلم لاتی ہے ہر رات نسیمؔ
کیوں انہیں درد کی آیات نہیں مانتا مَیں؟

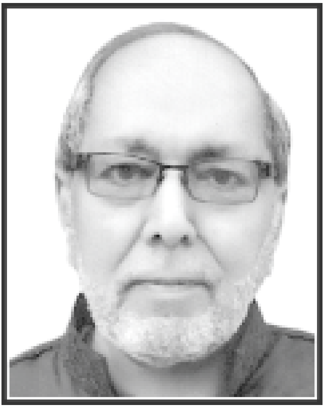

نسیمِ سحر

غزل

گنبد افلاک پر حد نظر تک روشنی
پرتو خورشید سے پہنچی قمر تک روشنی

ہوگیا بار آفریں چشم تلطف سے سماں
برگ گل شاداب ہے، پھیلی شجر تک روشنی

ظلمت شب کے مقابل جاں فشانی شرط ہے
ہے مقدر میں اسی صورت سحر تک روشنی

رفتہ رفتہ طاقچوں کے سب دیے گل ہوگئے
برق رفتاری سے پہنچی ہر نگر تک روشنی

حرمت الفاظ سے میری غزل ہے تابناک
دیدہ پرآب سے سوز جگر تک روشنی

سلسلہ ویرانیوں کا روز افزوں ہوگیا
ہے بظاہر مہتمم ہر ایک در تک روشنی

بے سبب ابلاغ دل افروز میں رخنہ پڑا
دسترس میں گرچہ تھی ہر نامہ بر تک روشنی

ہے ریاض دہر میں وہ بھی سکوں نا آشنا
جس کی نادانی سے پہنچی اس ڈگر تک روشنی

سید ریاض حسین زیدی

غزل

اِسی لیے ہمیں بھایا بہار کا موسم
یہی ملا تیرے قُرب و جوار کا موسم

خدا کرے کہ یقیں ایک دوسرے پہ رہے
گماں کی نذر نہ ہو اعتبار کا موسم

تمام عمر ترے خواب دیکھتے گزرے
طویل یوں بھی نہ ہو انتظار کا موسم

ترے کرم سے بھروسے نے ہم سے چھین لیا
خود اپنی ذات پہ دار و مدار کا موسم

ہمیں ہی سوچنا ہوگا کہ غیر چاہتے ہیں
کبھی نہ آئے محبت کا یار کا موسم

فراہمی نہیں آسان تیر و ترکش کی
گزر نہ جائے اِسی میں شکار کا موسم

کسی کو فصلِ نمو کا گلہ نہ ہو گلزار
اگر ہو سب کے لیے برگ و بار کا موسم

گلزار بخاری

غزل

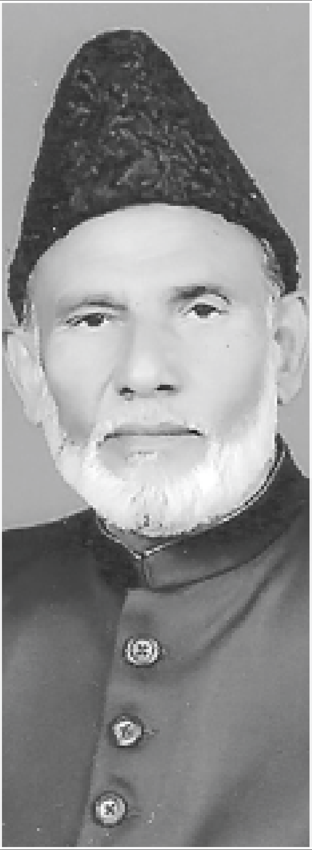

ہوا ، گلشن ، فضا ، موسم نشیلے
مجھے کہتے ہیں کچھ دن اور جی لے

کہیں شوق تمنا کے تقاضے
گھسے جاتے ہیں آنکھوں میں سجیلے

تعجب ہے کہ اس شیریں دہن سے
سنے ہم نے سخن کڑوے کسیلے

کہاں وہ لطف آواز ازل کا
سنے گرچہ بہت نغمے سریلے

کہیں شوق تمنا کے تقاضے
کہیں جلووں کے وہ محتاط حیلے

بہت بنتا ہے ساجد کی خبر لو
کہا جب یہ تو بولے ، لے ابھی لے

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زخم کو اپنی زندگی کا پتہ
ناوکِ ناگہاں سے ملتا ہے

غزل

گُم شدہ ساعتوں میں زندہ ہیں
ہم فقط البموں میں زندہ ہیں

تم کو دیکھا، تو یاد آئے وہ دن
جو ابھی خلوتوں میں زِندہ ہیں

ہم کبھی قُربتوں میں جیتے تھے
اور اب فاصلوں میں زِندہ ہیں

اِن دُکھوں کو دَوام مِل جائے
ہم اِنہی راحتوں میں زِندہ ہیں

یہ غمِ روزگار کے مارے
لوگ، اب خواہشوں میں زِندہ ہیں

وہی صدیوں سے جی رہے ہیں، جو
علم کی وُسعتوں میں زِندہ ہیں

ماورائے گُماں، نئی نسلیں!
نت نئی حیرتوں میں زِندہ ہیں

شاخ سے گر کے پائمال ہوئے
پھول، سب نکہتوں میں زِندہ ہیں

ہر نئے دن کے بعد، ہر نئی رات
بس اِنہی اُلجھنوں میں زندہ ہیں

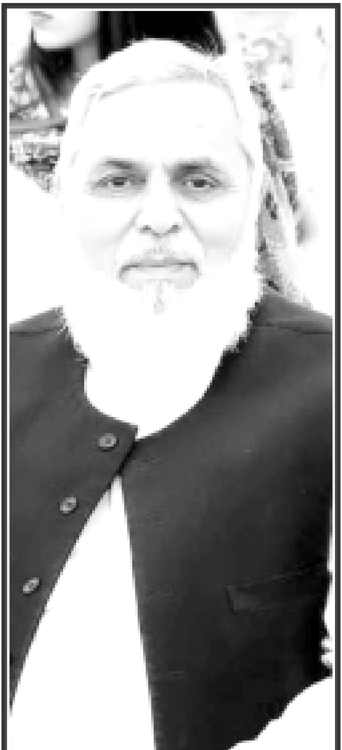

محمد انیس انصاری

غزل

جب وہ گلیاں دھوپ سے بھرنے لگی تھیں
بارشیں سرگوشیاں کرنے لگی تھیں

پانی اتنا صاف ہم نے کر دیا تھا
مچھلیاں تالاب کی مرنے لگی تھیں

پھول ہی تو بیچ پر رکھا تھا میں نے
تتلیاں کیا سوچ کر ڈرنے لگی تھیں!

خواب تعبیروں نے خود توڑا تھا لیکن
تہمتیں اس آنکھ پر دھرنے لگی تھیں

امڈی امڈی، گہری گہری، دل نشیں سی
اس کی آنکھیں مجھ کو دو جھرنے لگی تھیں

حامد یزدانی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزلیں

آنکھیں مَلیں تو خواب سزا کر دیا گیا
اک آفتاب، مجھ میں دیا کر دیا گیا

ہر شخص جان لے کے دیا لو ہے شہریار
نعمت کا خوان، کپڑا ہٹا کر دیا گیا

سکّے اچھال اچھال کے پھینکے گئے اُدھر
جو بھی دیا گیا وہ دکھا کر دیا گیا

چنگیر میری زرد گلابوں سے پاٹ دی
اُس کی طرف کا باغ ہرا کر دیا گیا

روزِ ازل سے گروی زباں اور آنکھ تھی
جو بھی کہا گیا، وہ کہا کر دیا گیا

اپنے لیے تو سانس بھی کوئی بچی نہیں
جتنا تھا جاں پہ قرض، ادا کر دیا گیا

قیوم طاہر

یہی تو اختیار میں تھا بس بنا دیا گیا
مکان کب مکاں رہا، قفس بنا دیا گیا

کِھنچی ہوئی جو سانس تھی وہ دیر تک کھنچی رہی
ذرا سا پَل فراق کا، برس بنا دیا گیا

جدائی کی وہ دھوپ تھی، بدن کی ریت تپ گئی
نگاہ و دل کے حسن کو، ہوس بنا دیا گیا

دھواں سا کر دیا گیا، چراغ سے وجود کو
مری غزل کا باغ خار و خس بنا دیا گیا

یہ میرا شعر و شہد تو، دھرے کا رہ گیا دھرا
جو زہر اُس کی بات کا تھا، رس بنا دیا گیا

غزل

ہر قدم پہ نئی خوشی ہوتی
زندگی اپنی زندگی ہوتی

صرف تُو ہی مجھے نظر آتا
اِس قدر تیز روشنی ہوتی

اشک کرتے طواف چہرے کا
پُھول پر خواب کی نمی ہوتی

زندہ رہنا محال تھا میرا
گر نہ تجھ پر نظر پڑی ہوتی

تُو اگر مہرباں ہو جاتا
میری دُنیا بدل گئی ہوتی

تُو بھی میری طرح بکھر جاتا
چوٹ تجھ کو اگر لگی ہوتی

عشق ہوتا نہ مجھ کو گر اقبال
میرے چہرے پہ بھی ہنسی ہوتی

اقبال سروبہ

غزلیں

پاؤں میں وسعت زمیں کی آسماں سر پر کھلا
کھلتا ہے کتنے امکاں ایک اک منظر کھلا

سو گیا اپنا مقدر آگئے سکتے میں ہم
بعد از بسیار دستک جب کسی کا در کھلا

ہنس دیا وہ شوخ تمہید کرم کے طور پر
آج اپنی موج میں آکر وہ لمحہ بھر کھلا

سامنے آئے مقفل کرکے دکھلائے مجھے
ایک دروازہ جو رہتا ہے سدا اوپر کھلا

حسنِ عریاں کو قسم دے کر کوئی پوچھے ذرا
کوئی اپنے گھر بھی رکھتا ہے بھلا زیور کھلا

جز محبت پیچھے رہ جائیں گی ساری نیکیاں
روزِ محشر جب مرے اعمال کا دفتر کھلا

خلق نے اتنی دعاؤں سے نوازا ہے مجھے
"خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا"

یہ گرہ بھی کھل ہی جائے گی یقیناً ایک دن
یعنی وہ پرواز مجھ سے کس کے کہنے پر کھلا

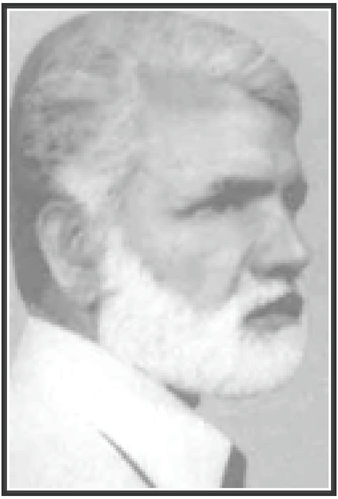

یعقوب پرواز

اگرچہ ہے وہ برسوں کی تمنا چھوڑ دیتے ہیں
دل اس کو چھوڑنا چاہے لہٰذا چھوڑ دیتے ہیں

وہ جن کی زندگی بے مقصدیت میں گزرتی ہے
سمندر میں وہ کاغذ کا سفینہ چھوڑ دیتے ہیں

مقامِ عشق پر فائز نہیں ہوتے ہوس زادے
سو نادانی میں چپکے سے شگوفہ چھوڑ دیتے ہیں

بلا کی تشنگی کو بھی لگا دیتے ہیں داؤ پر
انا پر حرف آتا ہو تو دریا چھوڑ دیتے ہیں

یقیں رکھتے نہیں وہ سبز قدروں کی حرارت پر
جو برفیلی ہواؤں میں پرندہ چھوڑ دیتے ہیں

مقامِ خاص رکھتی ہے یہ طرزِ انتقام ان کی
عدو پر رحم فرما کر جو زندہ چھوڑ دیتے ہیں

ہجومِ تیرگی میں کس لیے پرواز گھبرائیں
اندھیروں میں کہیں جگنو چمکنا چھوڑ دیتے ہیں

غزل

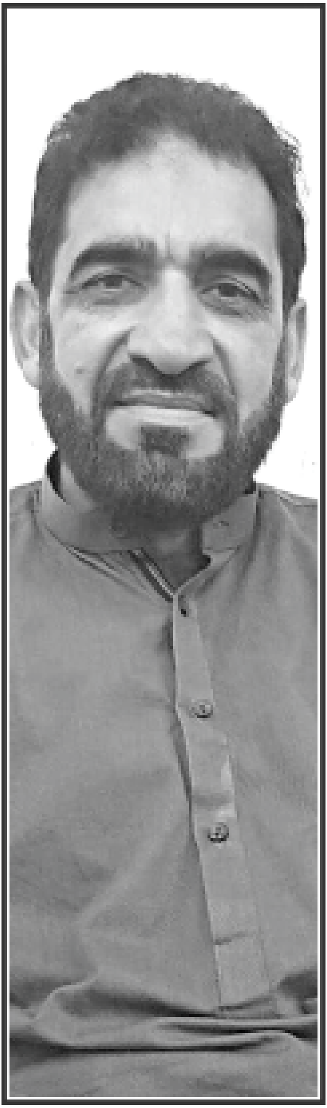

سعد اللہ شاہ

جو مسکرا کے چل دیے میرے ملال پر
میں نے بھی ان کو چھوڑ دیا ان کے حال پر

اونچا اڑا تو مجھ پہ ہوا منکشف جہاں
شرمندہ سا میں ہو گیا اپنے کمال پر

چلنے لگی ہوا تو بہت مسکرایا میں
لایا تھا شمع ذہن میں اس کی مثال پر

میرے لہو کی سرخیاں آنکھوں میں آ گئیں
کتنا سنہرا روپ تھا ماہ زوال پر

گو عقل کائنات پہ رکھتی ہے دسترس
لیکن یہ سر پکڑتی ہے دل کے سوال پر

چوروں کو تو نواز کے عزت بھی پائے گا
اے شہر یار آفریں تیرے خیال پر

ماں باپ جا چکے ہیں مگر سعد لگتا ہے
مامور ہیں وہ اب بھی مری دیکھ بھال پر

غزل

کہتے ہیں جس کو حُسن، وہ حُسنِ ادا میں ہے
وہ بات کس میں ہے جو مرے دلربا میں ہے؟

کیوں آسماں پہ چاند کو ہم ڈھونڈتے رہیں
اک چاند ہے کہ زُلفوں کی کالی گھٹا میں ہے

کعبے میں تُو نے جا کے جو مانگی دعا تو کیا
تاثیر سب دعاؤں کی ماں کی دعا میں ہے

اشکوں سے کیوں نہ دھوؤں میں دستِ حنائی کو؟
کس کے جگر کا خُون یہ رنگِ حنا میں ہے؟

گو کُشتۂ ستم ہوں مَیں ابرو کی تیغ کا
لیکن قرارِ جاں بھی تو تیغِ جفا میں ہے

یہ کیسا شور و غوغا ہے ہر اک گلی میں آج؟
یہ کس کی لاش کوچۂ ماتم سرا میں ہے؟

کہتا ہے کون وہ بُتِ سیمیں ہے بے وفا؟
کچھ کچھ وفا تو جعفری اُس بے وفا میں ہے

مقصود جعفری

غزل

معذور تتلیوں کے مقدر بنا دیے
پھولوں نے پتیوں سے نئے پر بنا دیے

چھت کے بغیر خیر سے کوئی نہیں رہا
اس آسماں نے سب کے لیے گھر بنا دیے

ان میں سے ایک ہم ہیں سو کس سے گلہ کریں
اس عشق نے بہت سے سخنور بنا دیے

تاریخ کر رہی ہے سوال اپنے آپ سے
اس نے بھی کیسے کیسے سکندر بنا دیے

کیا دل نے اہتمام کیا ٹھنڈی سانس کا
یہ گرمیوں کے دن بھی دسمبر بنا دیے

خود تو وہ خیر ہے ہی مگر دیکھ دیکھ کر
اس نے تو آئینے بھی ہیں پتھر بنا دیے

اس عاجزی کا ہم سے تدارک نہیں ہوا
جس عاجزی نے لوگ ستمگر بنا دیے

یہ بھی ہماری آپ کی صحبت کا فیض ہے
دریا پہاڑ پیڑ بھی خود سر بنا دیے

سانسوں کی وہ سرنگ تو اپنی جگہ مگر
دل میں نقب زنی نے نئے در بنا دیے

آنکھوں کو بند کر کے انہیں دیکھتے رہے
اندھوں نے کیا کمال کے منظر بنا دیے

الو ہر ایک شاخ کی رونق تھے اس لیے
جتنے بھی تھے بزرگ کبوتر بنا دیے

سہمے ہوئے ہیں اس لیے انگور آج کل
کیلے کے پیڑ وقت نے کیکر بنا دیے

پہلے سا پرسکون وہ دریا نہیں رہا
اس نے تو خشکیوں پہ سمندر بنا دیے

ہر سو برہمنوں کی کبھی جے جے کار تھی
حالات و واقعات نے شودر بنا دیے

مسعود احمد

غزل

یونہی دل چاہا تو اک تصویر بنا لی ہے
اپنے اندر دیکھا، اپنے آپ سے خالی ہے

اپنا آپ سمجھ نہ پایا پینسٹھ برس میں بھی
لیکن ساری دنیا میری دیکھی بھالی ہے

مہر و محبت، ہوش، عبادت، فقر فقیری روپ
زرگر ہی جانے ہے زر کو، رنگ جمالی ہے

عشق، کمالِ ذات، میں بولے، جب خاموشی سے
بادل گرجے، بجلی کڑکے، حال مثالی ہے

آج انیس احمد! عرفانِ درد ملا مجھ کو
میں نے اپنے آپ ہی اک تاویل بنا لی ہے

انیس احمد

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

رُخِ حیات کا غازہ، مرا غبار تو ہو
مرے وقار میں شامل ترا وقار تو ہو

غزل

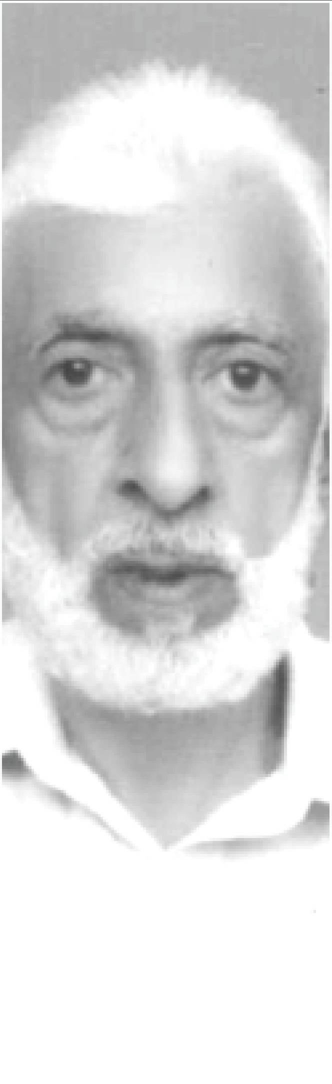

ضرورت ہی نہیں پڑتی اُسے سر کو جھکانے کی
جسے فرصت نہیں ہے دوستوں کو آزمانے کی

بنا لیتا ہے افسانہ ذرا سی بات ملنے پر
ہمیشہ ہی یہ دیکھی ہے بُری خصلت زمانے کی

تو پھر روتے ہو کیوں پگلے تو پھر غم کا گلہ کیسا
تڑپنے سے اگر بہتر ہے عادت مسکرانے کی

کرو پھر شکر کے سجدے خطاؤں پر خطا کارو
خدا نے دی ہے مُہلت تمھیں آنسو بہانے کی

اُنہی کاندھوں پہ رکھنا بوجھ مجبوری بڑوں کی ہے
کھلونوں سے ہے جن کی عمر یارو دل لگانے کی

کسی مجبور کی امداد کیسے اُس سے ممکن ہو
جو دل میں پال لیتا ہے ہوس دولت بڑھانے کی

تماشا گر نہیں بننا تمھیں اپنے پرائیوں کا
تو عادت ڈال لو شاہد ہمیشہ مُسکرانے کی

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

رضا اللہ حیدر

جلتے ہوئے دیار کے پھولوں کی خیر ہو
اب کے نئی بہار کے پھولوں کی خیر ہو

خونِ جگر سے سینچا گیا تھا چمن تمام
ہر شاخِ خوشگوار کے پھولوں کی خیر ہو

صیاد کے ستم سے بچائی روش روش
بھاگا ہے کوئی ہار کے، پھولوں کی خیر ہو

رنگوں نے جس کے ڈالی دھنک پر نئی کمند
اس حسنِ گل عذار کے پھولوں کی خیر ہو

خوشبو کی سرحدوں کا تعین نہ کیجیے
دریا کے آر پار کے پھولوں کی خیر ہو

ورنہ تو زخم زخم بدن کے گلاب ہیں
اے کاش دشتِ خار کے پھولوں کی خیر ہو

چھائے ہیں اس طرح کہ نہ چھٹنے کا نام لیں
بادل رضا غبار کے، پھولوں کی خیر ہو

غزل

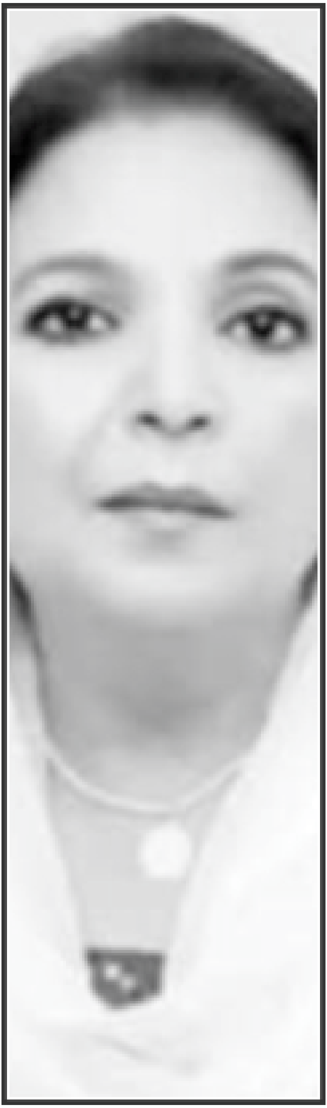

ہے باعثِ ثواب تجھے چھو کے آئیں ہم
روزِ ازل سے سوئے مقدر جگائیں ہم

خاموشیوں کے غار میں محکوم و بے زباں
اک دوسرے کے دل کو دھڑکنا سکھائیں ہم

آخر کو ایک حد ہے ہمارے بھی ضبط کی
اتنا نہ آزما کہ تجھے چھوڑ جائیں ہم

پھر کچھ عجب نہیں کہ سمٹ جائیں فاصلے
کچھ آپ آگے آئیں، قدم کچھ بڑھائیں ہم

دنیا میں زندگی کا سلیقہ کہاں ہمیں
خود سے فریب کھا کے کسے آزمائیں ہم

لے کر نیا سوال جو اُٹھتی ہے بار بار
اب کیسے اُس نظر سے نظر کو ملائیں ہم

خالدہ انور

غزل

عکس پھر کوئی بھی دیکھا نہ گیا تیرے بعد
آئنہ ٹوٹ گیا دے کے صدا تیرے بعد

دل کسی طاق میں رکھا ہے جلا کر میں نے
تا ابد جلتا رہے گا یہ دیا تیرے بعد

شور لہروں کا گھروندوں کو نگل جائے گا
بال کھولے گی سمندر کی ہوا تیرے بعد

تیرے پیچھے ہی چلے آتے تھے سب اہلِ جنوں
دشت میں پھر کوئی آیا نہ گیا تیرے بعد

جس جگہ چھوڑ دیا تو نے مجھے رستے میں
ایک مدت سے وہاں ہوں میں کھڑا تیرے بعد

اک ذرا پاؤں کے دھرتے ہی گھنے جنگل میں
نقش پر نقش قدم بنتا گیا تیرے بعد

کیا کروں گا ترے بارے میں وضاحت شاہد
مجھ سے دنیا نے اگر پوچھ لیا تیرے بعد

شاہد اشرف

غزل

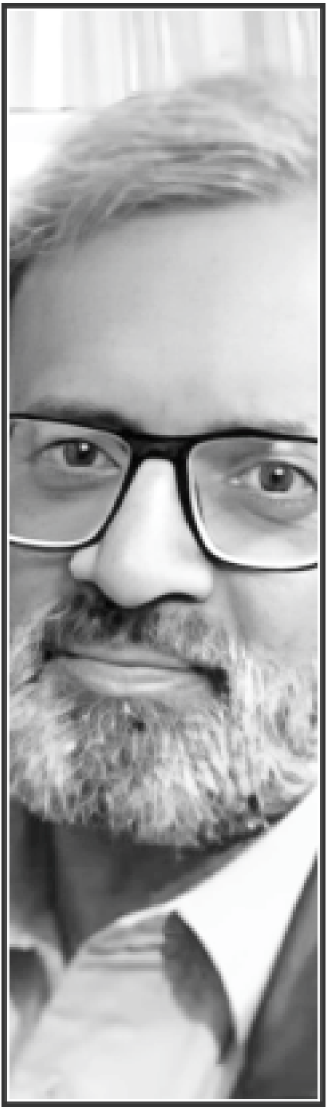

کوئی میری طرح جیے مرے ساتھ
کبھی روداد شب لکھے مرے ساتھ

میں تو سمجھا تھا دائمی ہیں دکھ
وہ بھی دو چار دن رہے مرے ساتھ

جھوٹ ایسا سنا کہ جس کا یقیں
آخری سانس تک چلے مرے ساتھ

ہے طبیعت غضب روانی میں
آئے اس دم کوئی بہے مرے ساتھ

چاہیے ہم سفر مزاج شناس
گیت لکھے، غزل کہے مرے ساتھ

کچھ پرانا نہیں کہانی میں
واقعے سب کے سب نئے مرے ساتھ

جن کی لو کو ہوا بڑھاتی تھی
ایسے دمساز تھے دیے مرے ساتھ

واصف سجاد

غزلیں

افتخار الحق

دریائے مقدر کو ذرا پار کریں ہم
پھر ساحلِ امکاں سے بھی گفتار کریں ہم

جو دن کے اجالے سے الجھتی ہے ہمیشہ
ہر رات اسی نیند سے تکرار کریں ہم

جینے کے ڈرامے کو حقیقت میں جو بدلے
کب دیکھیے ایسا کوئی کردار کریں ہم

خوابوں سے بنے غار میں تعبیر رُکی ہو
اور نیند سرک جانے کا دیدار کریں ہم

ممکن ہے کہ اک اور ملے عمرِ غلامی
اک عمر اگر خدمتِ سرکار کریں ہم

ہر خشتِ جہاں کرنے لگی ہے یہ تقاضا
معمار سے مل کر اسے مسمار کریں ہم

دنیا کو مبارک ہو یہ لفظوں کی لڑائی
بارود بھرے امن کا پرچار کریں ہم

جبینِ شہر پر تشویش کے تیور بنا ڈالے
فصیل اچھی بھلی تھی کچھ زیادہ در بنا ڈالے

پرندوں نے تذبذب کا تعلق دیر تک رکھا
بالآخر ہاتھ شاخوں سے ملا کر گھر بنا ڈالے

ذرا پگھلا کے اب اپنا سراپا دیکھنا ہوگا
گزشتہ عکس آئینے نے سب پتھر بنا ڈالے

تمہارے لشکرِ تخلیق کی شامت لازم ہے
ہمارے مہر امکاں نے کوزہ گر بنا ڈالے

تمہارے لشکرِ تخلیق کو ہونا پڑا پسپا
ہماری فوجِ امکاں نے جو کوزہ گر بنا ڈالے

رہائی اور اسیری میں عجب سی کشمکش ہے اب
میں پنجرہ بن چکا تھا کس نے بال و پر بنا ڈالے

نکل کر دل کے جامِ جم سے جب میں لوٹ کر آیا
کسی چوتھے زمانے کے کئی منظر بنا ڈالے

ستاروں نے نجانے آسماں سے کب یہ گُر سیکھا
ذرا سی چال بگڑی تو نئے محور بنا ڈالے

غزل [مجید امجد کی یاد میں]

گلے لگائے ہیں ہم نے سدا گُلاب کے پھول
ہے سارے شہر میں اپنا پتا گُلاب کے پھول

حسین چہروں سے میں ہر ورق سجاتا رہا
کتابِ دِل کو بناتا رہا، گلاب کے پھول

ردیف میں نے جو مانگی مجید امجد سے
پھر اس کے بعد چلا سلسلہ گُلاب کے پھول

تمھارے رُخ کی فقط اک جھلک پہ قرباں ہیں
یہ تتلیاں ، یہ مہکتی ہَوا ، گلاب کے پھول

جنابِ میرؔ نے دیکھی تھی رنگِ گُل کی آگ
ہیں شاخ شاخ پہ جلتا دیا، گُلاب کے پھول

خُود اُس نے عُمر گزاری ہے خارزاروں میں
جو بانٹتا رہا سب میں سدا گلاب کے پھول

کبھی تو آئیں گے غالبؔ بھی لالہ وگُل میں
یہ سوچ کر میں اُگاتا رہا گلاب کے پھول

طلوعِ مہر سے پہلے لبوں پہ حمد و ثنا
سحر کی کرتے ہیں یُوں ابتدا گلاب کے پھول

یہ پتھروں کا کلیجہ بھی موم کر دیں گے
تو مورچے نہ بنا، بس اُگا، گُلاب کے پھول

اس آسرے پہ گزاری حیات کانٹوں میں
ملے گا حشر میں اس کا صلہ گلاب کے پھول

یہ کون چھُپ کے ہماری گلی سے گزرا ہے؟
گھروں میں سب کے کِھلے خوشنما گلاب کے پھول

ہے مثلِ مہرِ درخشاں ترے شباب کی لو
تمھارے لب بھی ہیں دو آتشہ گلاب کے پھول

ہماری نیند کہیں مہک سے نہ اُڑ جائے
ہماری قبر سے وہ لے گیا، گُلاب کے پھول

جھلک سے جن کے ملے پیار کو بھی بینائی
وہ شاخِ دل پہ کِھلے پارسا گلاب کے پھول

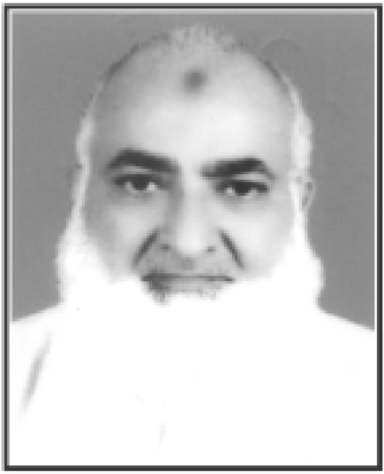

عقیل رحمانی

ہَوا کو چھلنی بدن نفرتوں کے کانٹوں سے
دہکتے زخموں کو ہم نے کیا، گلاب کے پھول

دُکھوں کی دھوپ بھی مایوس ہو کے پلٹے گی
ہیں والدین جو سایا نُما گلاب کے پھول

خدا کا شُکر کہ آیا ہے آج سال نیا
سبھی میں بانٹ دے خوشیاں، لُٹا، گلاب کے پھول

حنا کے رنگوں سے نکھرے مہکتے جاتے ہیں
ہمیں لگے ہیں تیرے نقشِ پا، گلاب کے پھول

اُنہی کی ایک جھلک لوٹتی ہے، ہوش و خرد
ہیں زندگی کا کڑا مرحلہ، گلاب کے پھول

ہوئی ہیں مدتیں جس سے جُدا ہوئے مجھکو
اُسی سے اب ہے مرا رابطہ گلاب کے پھول

عقیل ماننے والے ہیں اُس نبیؑ کے ہم
دہکتی آگ کو جس نے کیا، گلاب کے پھول

غزل

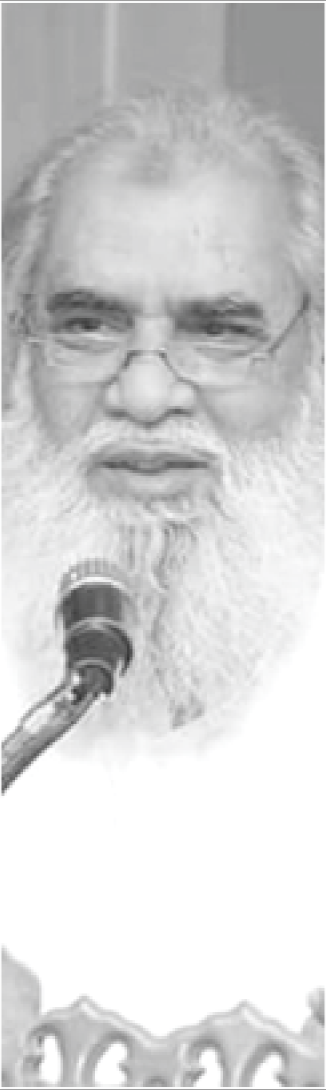

ہاتھی پالا، شیر سدھایا جا سکتا ہے
پھر تو اس کو یار، منایا جا سکتا ہے

ہریالی سے پیار ہے اس کو، اس کی خاطر
جنگل کھینچ کے شہر میں لایا جا سکتا ہے

ہو سکتا ہے ٹھیک نشانے پر لگ جائے
تاریکی میں تیر چلایا جا سکتا ہے

جاگنے والے شخص پہ وقت نہ ضائع کرنا
سونے والا شخص جگایا جا سکتا ہے

دریا کی بپھری لہروں کی منت کر کے
ڈوبنے والا شخص بچایا جا سکتا ہے

پل تو دور ہے پر اس شخص کی ضد کی خاطر
دریا کے اس پار بھی جایا جا سکتا ہے

لیکن خواب اگانے کی فرصت بھی دے وہ
سو جائیں تو خواب اگایا جا سکتا ہے

اکرم ناصر

غزل

ضربِ خوں بار آخری تو نہیں
میں عزادار آخری تو نہیں

پہلا پتھر ہے شاہ کی جانب
مری للکار آخری تو نہیں

اور بھی آئیں گے سرِ مقتل
میں گنہگار آخری تو نہیں

امتحاں اور بھی ہیں میرے لیے
تیرا انکار آخری تو نہیں

تیر ہیں اور بھی کمانوں میں
نشترِ یار آخری تو نہیں

قافلہ جبر کا رواں ہے اگر
حلقۂ دار آخری تو نہیں

میرے پیچھے ہے سر پھروں کا ہجوم
میری تلوار آخری تو نہیں

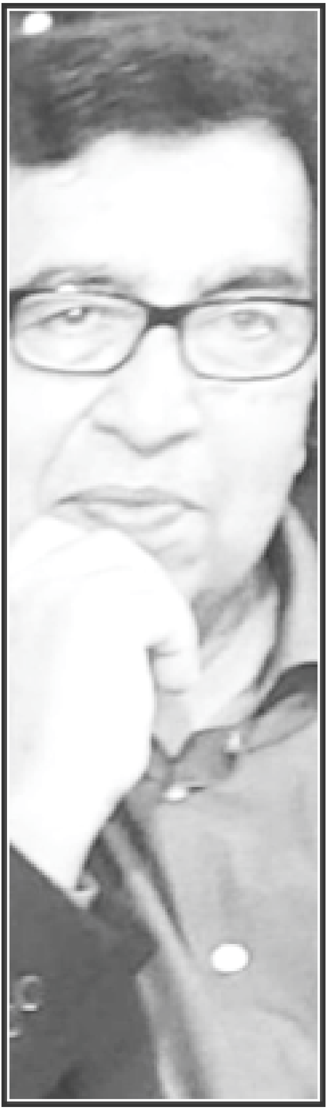

صابر رضا

غزل

احمد جلیل

ہر گھڑی تمہارا ہی انتظار رہتا ہے
بے حساب رہتا ہے بے شمار رہتا ہے

اس کے وعدے جھوٹے ہیں سارے خواب ٹوٹے ہیں
پھر بھی جانے کیوں دل کو اعتبار رہتا ہے

کیسے اوڑھ لوں دوری مان بھی لے مجبوری
پیار میں کہاں دل پر اختیار رہتا ہے

جب نظر نہیں آتا کچھ سمجھ نہیں آتا
کیا بتائیں کیا دل کا حال زار رہتا ہے

روگ کیا لگا من کو میرے دل کا دامن تو
چاک چاک رہتا ہے تار تار رہتا ہے

خواب وصل کے سارے تیرے ہجر میں ہارے
تیری ہی جدائی کا دل کے پار رہتا ہے

ہر گھڑی جو ہنستا تھا ہر گھڑی چہکتا تھا
وہ جلیل اب غم کا اشتہار رہتا ہے

غزل

غم کا رشتہ بڑا پرانا ہے
مرتے دم تک اسے نبھانا ہے

تم سے پہلے بھی تم ہی رہتے تھے
خانۂ دل تمھیں دکھانا ہے

کیوں نئی زندگی میسر ہو
ایک دن سب نے مر ہی جانا ہے

تیری بدنامیوں سے ڈرتا ہوں
ورنہ موسم بڑا سہانا ہے

تو ملاقات کا دکھاوا کر
میں نے دل ساتھ لے کے آنا ہے

روٹھنا بھی مرا نہیں ممکن
کس نے مجھ کو بھلا منانا ہے

تھپتھپانا ہے حسرتوں کو بھی
اور خوابوں کو بھی سلانا ہے

بن دعا آسماں سے بارش ہو
ایسی بارش میں ہی نہانا ہے

جس کی خاطر گرے ہو تم اتنے
اس نے تم کو نہیں اٹھانا ہے

آسماں بھر چکا ہے تاروں سے
اب زمیں کو مجھے سجانا ہے

اور نشتر چلاؤ اور چلاؤ
تم کو ایسے ہی اب تھکانا ہے

تو بھی دل سے اتر چکا کب کا
پھر بھی یہ سچ ابھی چھپانا ہے

چاند خود تو چمک نہیں سکتا
یہ بھی تیری طرح سیانا ہے

ہیں یہ ظالم میرے نشانے پر
زہر شربت میں بھی ملانا ہے

ہوں قیامت کا منتظر آصف
حشر سا اب وہاں اٹھانا ہے

آصف خیال

غزل

آنکھ میں نیلاہٹیں تو بھر رہے ہو
ساحلوں سے واپسی کب کر رہے ہو

کتنی شاموں کی گھنی ویرانیوں میں
مثلِ حرفِ آشنا ازبر رہے ہو

مور پانی پینا چاہیں صحنِ دل میں
قحط سالی کے کٹورے دھر رہے ہو

سونپ دی ہے تیرگی اب شہر بھر کی
اور کبھی تارا ہتھیلی پر رہے ہو

کرچیوں میں بانٹ کر اِترائے جائے
آئینہ آئینہ جس پر مر رہے ہو

یاد کی چلتی ہوئی تصویر میں بھی
ہجر کا ٹھہرا ہوا منظر رہے ہو

اُس طرف آنے کی سب سمتیں بُھلا دیں
اک زمانہ جس شکستہ گھر رہے ہو

کیا کوئی آسیب آ کر بس گیا ہے
کیوں یہ گھر تنویر خالی کر رہے ہو

تنویر قاضی

غزل

لگتے ہیں وُہی صبح و مسا اب کے برس بھی
ہے سہمی ہوئی آب و ہوا اب کے برس بھی

محصور بدستور ہے وُہ قبلۂ اوّل
مجبور ہے مظلوم غزہ اب کے برس بھی

حیران فلک ہے تو پریشان زمیں ہے
بدلا ہی نہیں رنگِ فضا اب کے برس بھی

مزدور ہے مزدور تو زردار ہے زردار
سرمائے سے محنت ہے خفا اب کے برس بھی

اے مالکِ کونین! تیری محفلِ کونین
ہے مرکزِ فریاد و بکا اب کے برس بھی

ہے دیوِ ستم جکڑے ہوئے عدل پری کو
لرزیدہ ہے میزانِ وفا اب کے برس بھی

فکرِ شکم، اربابِ محبت پہ گراں ہے
ہیں دیدہ و دل، آبلہ پا اب کے برس بھی

بازار میں، دربار میں، گھربار میں دیکھو
اِک طُرفہ قیامت ہے بپا اب کے برس بھی

قاتل سے مکافاتِ عمل دُور ہے کوسوں
مقتول پہ واجب ہے سزا اب کے برس بھی

فیضانؔ بدرگاہِ خداوندِ دوعالم
ہم لوگ ہیں مشغولِ دُعا اب کے برس بھی

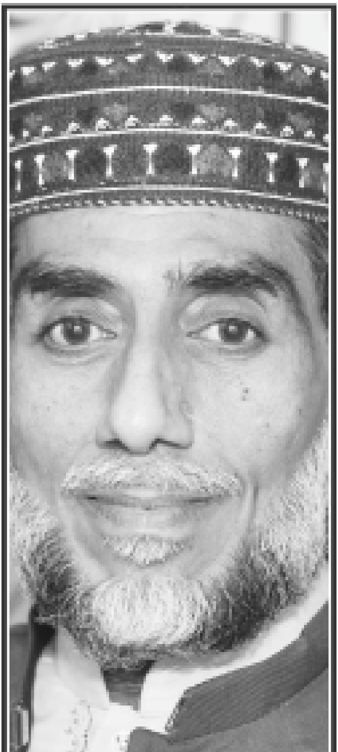

فیض رسول فیضان

غزل

مختار آذر کربلائی

مقدّر کو اپنا بنانے کی خاطر
تجھے کھو دیا ہے زمانے کی خاطر

چراغ اس نے بستی کے گل کر دیے ہیں
مرے اک دیے کو بجھانے کی خاطر

مری پشت پر وار اُس نے کیا ہے
جھکا تھا میں جس کو اٹھانے کی خاطر

زمانے کو جس کے لیے مَیں نے چھوڑا
مجھے اُس نے چھوڑا زمانے کی خاطر

تری بزم میں آ گیا کربلائی
نئے گیت تجھ کو سنانے کی خاطر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

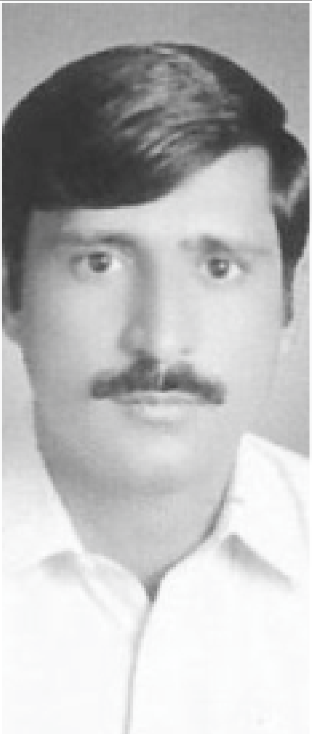

اعجاز دانش

ہم اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہتے ہیں
کسی کو نیند سے بیدار کرنا چاہتے ہیں

میں جانتا ہوں تبھی تو یہاں نہیں رکتا
جو گفتگو در و دیوار کرنا چاہتے ہیں

وہ اپنے مرمریں ہاتھوں کا دے کے بوسہ ہمیں
وہ اور کتنا گنہگار کرنا چاہتے ہیں

سنا ہے مجھ سے تعلق پہ وہ ہیں آمادہ
مجھے بھی وہ گل و گلزار کرنا چاہتے ہیں

انھیں بتاؤ کہ رب نے دیا ہے یہ منصب
جو میری ذات کا انکار کرنا چاہتے ہیں

انھیں پتہ نہیں دانش میں پیار کرتا ہوں
جو میرے لہجے کو تلوار کرنا چاہتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رُخِ حیات کا غازہ ، مرا غبار تو ہو
مرے وقار میں شامل ترا وقار تو ہو

غزل

کہانی اب پرانی ہو گئی ہے
محبت داستانی ہو گئی ہے

کھرے کھوٹے کی ہے پہچان اسکو
رعایا اب سیانی ہو گئی ہے

بچھڑ جاؤ کہ اس میں مصلحت ہے
بڑی مشکل نبھانی ہو گئی ہے

کسی کے کام آنا زندگی ہے
یہ رسم اب تو پرانی ہو گئی ہے

زمانہ چال الٹی چل رہا ہے
"یہ دنیا اب پرانی ہو گئی ہے"

تو کیا وہ شہر میں آئے ہوئے ہیں
فضا کتنی سہانی ہو گئی ہے

مصاحب شاہ کے اترا رہے ہیں
کہ انکی حکمرانی ہو گئی ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

مرے نفس سے دمِ عندلیب شرمائے
مگر چمن میں مری کوئی شاخسار تو ہو

غزل

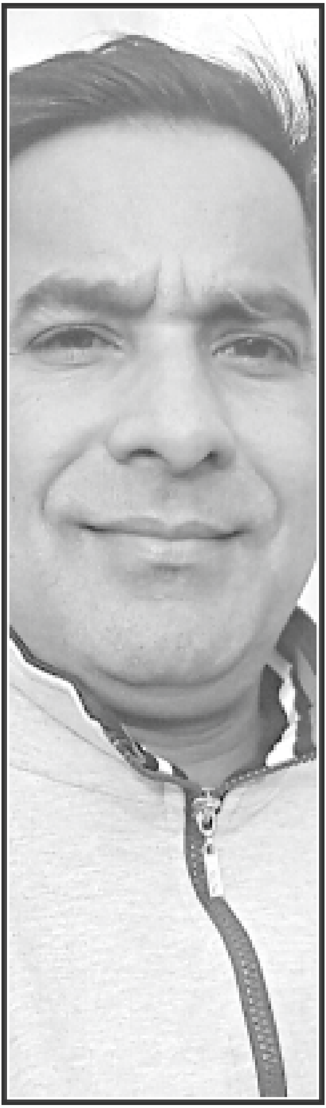

یاد کرتا ہوں خدا کو جو پریشانی میں
مشکلیں میری بدل جاتی ہیں آسانی میں

زندگی اپنی نظر آنے لگے مثلِ بہار
فرق مٹ جائے جو درویشی و سلطانی میں

دیکھنا رونقِ گلزار نظر آئے گی
اپنی ویرانی ملا دو مری ویرانی میں

قریہء ذات کو لوٹ آئے تو معلوم ہوا
کھو چکے خود کو بھی ہم شوقِ جہانبانی میں

در و دیوار جسے روک نہیں سکتے ہیں
کوئی آزاد منش رہتا ہے زندانی میں

اپنی بے کیفی و بے لذتی کیا بانٹتا میں
ہم سفر ڈھونڈتا کیا بے سر و سامانی میں

جتنی آسان نظر آتی ہے آسان نہیں
شیوۂ میر کی تقلید غزل خوانی میں

خود سے تنہائی میں دانا بھی ہیں کہتے جاذب
عمر کا سارا سفر کاٹا ہے نادانی میں

اکرم جاذب

غزل

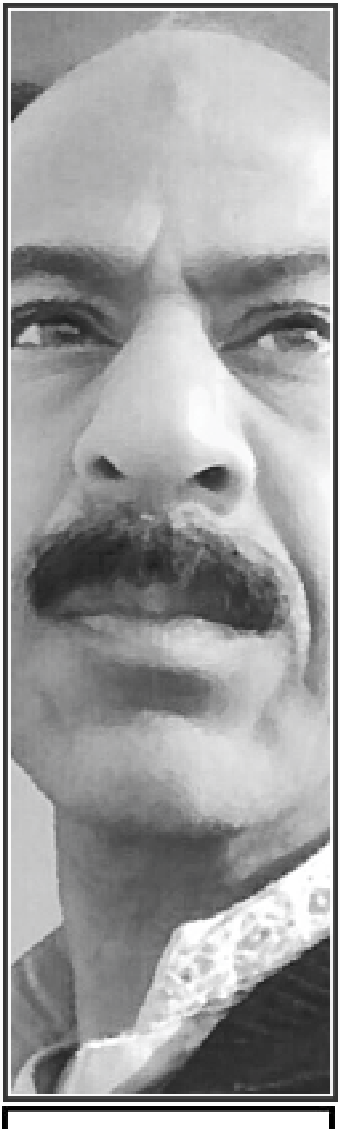

نبیل قیصر

شکوہ کیا کیجے بلاؤں کا
ہے نتیجہ مری خطاؤں کا

بے سہارا نہیں ہوں دنیا میں
ہے سہارا تری دعاؤں کا

بعد مدت کے ہم جو آئے یہاں
رنگ بدلا تھا میرے گاؤں کا

تیرے چہرے پہ کوئی نور نہیں
ہے یہ سہارا کرم گھٹاؤں کا

بھولتا ہی نہیں وہ لطف مجھے
اس کی پلکوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا

ہم جو دنیا سے رہ گئے پیچھے
کام یہ بھی ہے آشناؤں کا

چلتے چلتے ہوئے فگار نبیل
حال دیکھو تو میرے پاؤں کا

غزل

یہ کارِ سخن کارِ محبت کی طرح ہے
جو وقت گزرتا ہے مشقت کی طرح ہے

میں اسکا محافظ ہوں دل و جاں سے ابھی بھی
جو خواب مرے پاس امانت کی طرح ہے

افسوس وہاں عمر بسر کرنی پڑے گی
جینا جہاں ہر آن اذیت کی طرح ہے

جب تک ہیں مری ماں ترے قدموں پہ مرے ہاتھ
یہ دنیا مرے واسطے جنت کی طرح ہے

ہم روٹھ بھی جائیں تو بچھڑنے نہیں دیتا
یہ ایک تعلق جو محبت کی طرح ہے

اب اہلِ سیاست کا چلن تم میں بھی آیا
ہر کام کا کہتے ہو عبادت کی طرح ہے

شمشیر وہ مل جائے تو ہو جاؤں مکمل
خوابوں میں بھی جو شخص حقیقت کی طرح ہے

شمشیر حیدر

غزلیں

بزم میں اپنی پھر بُلا مجھ کو
مسندِ عشق پر بٹھا مجھ کو

وہ بچھڑنے پہ تو اُداس نہ تھا
جانے کیوں دیکھتا رہا مجھ کو

مجھ میں رہتا تھا جو وہ روٹھ گیا
آئینہ اب نہیں دکھا مجھ کو

میں ہوں لا وقت کی ضیافت میں
وقت نے راستہ دیا مجھ کو

میں تو اب تک ترے حصار میں ہوں
کون کہتا ہے بے وفا مجھ کو

آتے جاتے رہا کرو تم بھی
اچھا لگتا ہے سلسلہ مجھ کو

روح میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں
تم نے جب پھول سا کہا مجھ کو

چھوڑ دے ہجر کی کہانی کو
داستاں وصل کی سُنا مجھ کو

رشبہ طراز

ہمارے ذوق کا اس نے یہ انتظام کیا
ہر اک مقام پہ رنگوں کا اہتمام کیا

نہ دیکھا جس نے ہمیں ہم نے بھی نظر نہیں کی
ہاں جس نے پیار سے دیکھا اسے سلام کیا

رہی جو دھوپ تو اپنے قدم سفر میں رہے
جہاں جھکے ہوئے بادل ملے قیام کیا

مثالِ حضرتِ یوسف جہاں سے گزرے تم
تمام زہرہ جمالوں کا قتلِ عام کیا

گلی اُداس رہی جس سے تم گزرتے تھے
ہزار بار دیے کو سپردِ بام کیا

اکیلی راہ گزر میں کئی مقام آئے
تمہاری یاد کو ہر گام پہ امام کیا

غزل

ہم کو اِک ہم زباں میسّر ہے
یعنی سارا جہاں میسّر ہے

ہم دکھاتے نہیں ہیں زخموں کو
ایک بابِ نہاں میسّر ہے

دُنیا داری کے روگ ہیں مُرشد
یہ کہاں وہ کہاں میسّر ہیں

دل کی پرواز آسمانوں تک
لامکاں میں مکاں میسّر ہے

ہم غریبوں کی موج تو دیکھو
خواب کا اِک جہاں میسّر ہے

ہجر کی تلخیاں قبول کرو
عشق کو مہرباں میسّر ہے

کتنا سستا ہے درد کا سودا
جہاں چاہو وہاں میسّر ہے

کس کو رکھنا ہے کس کو چھوڑیں گے
اِک یقیں اِک گماں میسّر ہے

اُس کی یادوں کا ہو کہ حسرت کا
آنکھ کو اِک دُھواں میسّر ہے

عمر بھر کی ریاضتوں کے بعد
ہم کو اب تیری ہاں میسّر ہے

اِک سفر پانیوں پہ لکھا ہے
ایک صحرائے جاں میسّر ہے

کتنا دُشوار حالِ دل کہنا
کہنے کو اب زباں میسّر ہے

خامشی ہے کہ بڑھتی جاتی ہے
سوچ کو اِک فغاں میسّر ہے

بات سے بات پھر نکلتی ہے
نت نئی داستاں میسّر ہے

اِس جبیں کی یہ خوش نصیبی ہے
سجدے کو آستاں میسّر ہے

اب ستاتی نہیں ہے دھوپ مجھے
آس کو سائباں میسّر ہے

آسناتھ کنول

غزل

اب تو اس کی یاد کا بھی سامنا ہوتا نہیں
زندگی یونہی گذرنی ہے تو کچھ اچھا نہیں

آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا ہے منظر شام کا
سامنے وہ وقت ہے جو ایک سا رہتا نہیں

اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا
کیا یہاں ممکن نہیں ہے کیا یہاں ہوتا نہیں

شام آتی ہے تو رک جاتی ہے میرے صحن میں
شام ہوتے ہی گذر جاتا ہو دن ایسا نہیں

دن گذرتے جا رہے ہیں اور مری مصروفیت
اس طرح کی ہے کہ تم سے رابطہ ہوتا نہیں

سب نظر آ جائے گا جب دیکھنا چاہو گے تم
عمر بھر تو پردۂ حیرت گرا رہتا نہیں

مجھ پہ کچھ کھلتا نہیں کہتے ہیں کیا عاصم اسے
سامنے ہوتا ہے وہ تو دل مرا ہوتا نہیں

عاصم اعجاز

غزل

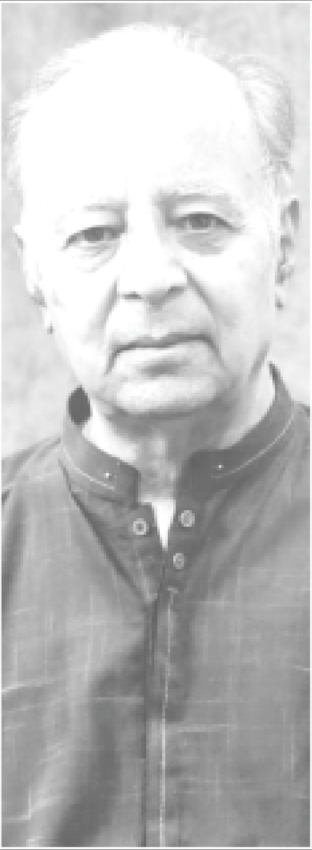

سمیع اللہ عرفی

پابہ زنجیر کر کے چھوڑ گیا
مجھ کو تسخیر کر کے چھوڑ گیا

خود بسا ہے نہ اس کی یاد بسی
گھر کو تعمیر کر کے چھوڑ گیا

اپنی بدنامیوں سے ڈرتا رہا
میری تشہیر کر کے چھوڑ گیا

خواب سارے ہی معتبر اس کے
سب کو تعبیر کر کے چھوڑ گیا

عرفی جاتے ہوئے مرا مرشد
مجھ کو بے پیر کر کے چھوڑ گیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

غزل

گلہ نہ کر ترا شکوہ سرا سا لگتا ہوں
تری ہی بزم کا اک ہمنوا سا لگتا ہوں

نہیں کہ تجھ سے ہی رنجیدگی کا عالم ہے
میں آج خود سے بھی کچھ کچھ خفا سا لگتا ہوں

وہ داستاں ہوں کہ بھولی ہوئی سی ہے تجھ کو
وہ لفظ ہوں کہ مٹایا ہوا سا لگتا ہوں

میں گھر کے حلقۂ اہلِ حرم میں بیٹھا ہوں
نرالی وضع ہے، سب سے جدا سا لگتا ہوں

تُو ہمسفر مرا بن جا کہ اس دیار میں دوست
میں اجنبی ہوں اکیلا بُرا سا لگتا ہوں

میں ویسے کچھ بھی تو روشن نہیں مگر واللہ
پیئے ہوئے ہوں تو خود کو خدا سا لگتا ہوں

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گُم راہ بھی ہم کبھی رہے ہیں
اس فخر میں کچھ عجب نشے ہیں

غزل

ایسا ہرگز دلِ خستہ ! نہیں ہونے والا
جو پرایا ہے وہ اپنا نہیں ہونے والا

دردِ فرقت کا مداوا نہیں ہونے والا
معجزہ ہو کہ کرشمہ ، نہیں ہونے والا

زندگی ، کھیل تماشے سے عبارت ہے ، مگر
اب نیا اور تماشا نہیں ہونے والا

ربِ واحد پہ بھروسا ترا پختہ ہے تو پھر
کہیں ایسا ، کہیں ویسا ! نہیں ہونے والا

جان بخشی کے عوض قدموں پہ رکھوں دستار
میرا پندار تو سستا نہیں ہونے والا

حسنِ بے مہر کو معلوم نہیں ہے شوکت
دل کسی طور شکیبا نہیں ہونے والا

شوکت محمود شوکت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دستِ ہَوا سے پرتو ادراک ہو گئے
بادل بکھر کے دامنِ صد چاک ہو گئے

غزل

اگرچہ سازشوں میں لاکھ شر پسند رہے
جو سر بلند تھے وہ لوگ سر بلند رہے

بدل سکا نہ کوئی ظلم بھی مزاج اپنا
ہزار درد اُٹھا کر بھی دردمند رہے

وہ چاہتے ہیں کہ اُونچا اُڑے نہ کوئی یہاں
فلک کی سمت نہ اب کوئی بھی کمند رہے

ہم ایسے لوگ کسی کو نہ آئے راس کبھی
ہم ایسے لوگ ہمیشہ ہی ناپسند رہے

کہیں سے آئی نہ کوئی صدا محبت کی
کواڑ جتنے تھے بستی کے سارے بند رہے

اُٹھے نہ تیری طرف کوئی بھی نگاہِ حسد
اے میرے آہو! سلامت تری زقند رہے

نثار چاند، ستارے ہوں تیری قامت پر
ترا نصیب فلک سے بھی کچھ بلند رہے

نبیل اِس لیے بھی معتبر رہے ہم لوگ
ہم اُس نگاہِ سخن زار کی پسند رہے

قدم قدم پہ تجھے عافیت عطا ہو نبیل
ترے غنیم کی اب بھی زبان بند رہے

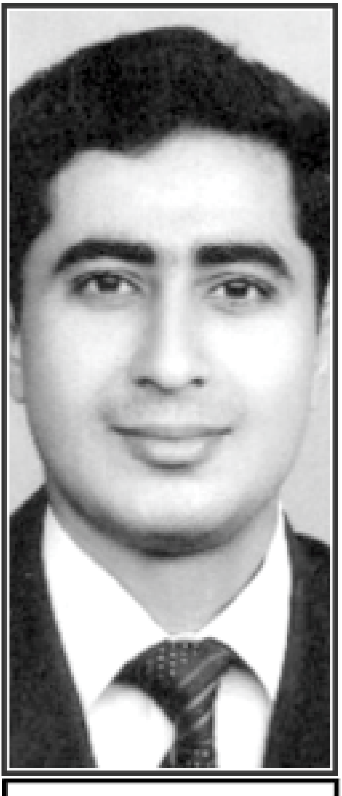

نبیل احمد نبیل

غزل

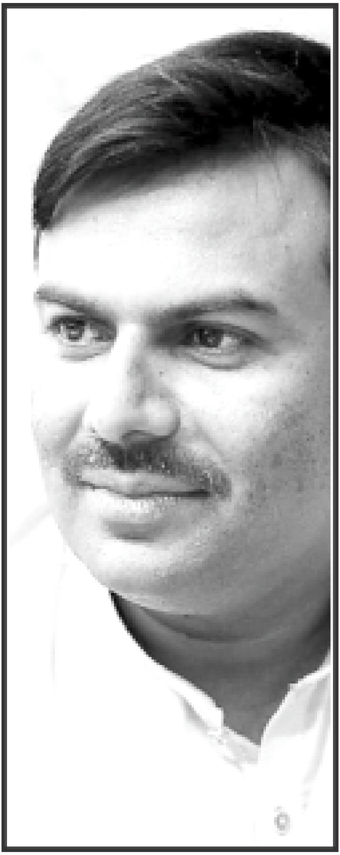

کنایہ ہو کے رہنا ہے، اشارہ ہو کے رہنا ہے
مجھے تاریک راتوں میں ستارہ ہو کے رہنا ہے

تمھارے شہر کی گلیوں میں جلنا اور بجھنا ہے
مجھے جگنو کی صورت اک شرارہ ہو کے رہنا ہے

زمانے میں بنوں گا میں محبت کی مثال ایسی
تجھے اپنا بنانا ہے ، تمھارا ہو کے رہنا ہے

یہی نسبت مجھے کافی، یہی دولت مجھے کافی
تُو راوی ہے مجھے تیرا کنارا ہو کے رہنا ہے

یقیں ہوتا چلا جاتا ہے مجھ کو دم بدم حماد
کہ اک دن حسنِ زیبا کا نظارہ ہو کے رہنا ہے

حماد ریاض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزلیں

کوئی تو چھوڑیے سنجیدہ گفتگو کی جگہ
کہ ہر جگہ نہیں ہوتی ہے ہاؤ ہو کی جگہ

یہ کیا ہوا ترے مہماں نواز کوچے کو
ہر ایک ہاتھ میں خنجر ہے اب سبو کی جگہ

ہمیں عدم میں پڑے اس گلاب کا دکھ ہے
جسے ملی نہ کسی شاخ پر نمو کی جگہ

تم ایک حد سے گزرنے لگے ہو، دھیان رہے
ہمارے دل میں نہیں ہے کسی عدو کی جگہ

ہمارا دل کوئی بازار تو نہیں دنیا!
بنائیں کس طرح تجھ ایسی فالتو کی جگہ

سجاد بلوچ

شش جہت میں مرے خوابوں کی کوئی سمت نہیں
جو دکھائی گئی مجھ کو وہ مری سمت نہیں

چار سو اپنی ہی افتاد سے ٹکراتا ہوں
بچ نکلنے کی کوئی راہ، کوئی سمت نہیں

دور جا کر مجھے ہر بار خیال آتا ہے
کس طرف جاتا ہوں میں، یہ تو مری سمت نہیں

اس لیے حجرۂ غفلت میں بجھا بیٹھا ہوں
میں اندھیروں کی لڑائی میں کسی سمت نہیں

اور سمتیں بھی ہیں اس آئنہ خانے میں دوست!
جس طرف تو ہے، فقط ایک یہی سمت نہیں

میری نظروں میں نہ ہو کر بھی ہے ہر جانب تو
میں کہ ہر سمت بکھر کر بھی کسی سمت نہیں

غزل

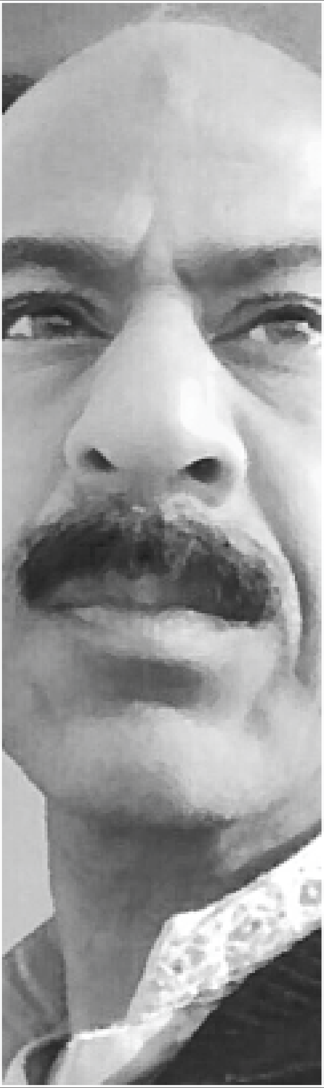

نبیل قیصر

شکوہ کیا کیجئے بلاؤں کا
ہے نتیجہ مری خطاؤں کا

بے سہارا نہیں ہوں دنیا میں
ہے سہارا تری دعاؤں کا

بعد مدت کے ہم جو آئے یہاں
رنگ بدلا تھا میرے گاؤں کا

تیرے چہرے پہ کوئی نور نہیں
ہے یہ سارا کرم گھٹاؤں کا

بھولتا ہی نہیں وہ لطف مجھے
اس کی پلکوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا

ہم جو دنیا سے رہ گئے پیچھے
کام یہ بھی ہے آشناؤں کا

چلتے چلتے ہوئے فگار نبیل
حال دیکھو تو میرے پاؤں کا

غزل

اک ستارہ ہے اندھیرے کی قبا میں روپوش
روشنی آنکھ سے اوجھل ہے خلا میں روپوش

چاند نکلا تو سمندر میں اٹھی طغیانی
جل پری ہوتی ہے لہروں کی ردا میں روپوش

ہو گیا خاک اڑاتا ہوا سلطاں زادہ
چھوڑ کر باغِ عدن ملکِ خدا میں روپوش

ایک ٹوٹی ہوئی درگاہ میں شاہِ جنات
اور ہم معبدِ آسیب زدہ میں روپوش

مشعلِ کہنہ بھی خاموش ہوئی آخرِ شب
اک قلندر رہا جنگل کی گپھا میں روپوش

ساعتِ عصر، شفق رنگ جو رم کرتا تھا
آہوئے تشنہ ہوا دشتِ بلا میں روپوش

ماہ و مریخ بھی ہو جائیں گے اک دن افسوس
چاہِ تاریک میں اور چاہِ فنا میں روپوش

اک خدا بندۂ ایمان کے دل میں موجود
اور اک بندہ کہ ہے ملکِ خدا میں روپوش

عابد رضا

غزل

پاس میرے بیٹھ کر اے نامہ بر مجھ کو بتا
کیا لکھا ہے خط میں پھر اس نے زبانی کیا کہا

ہو سکے تو لوٹ کر تو آج میرے پاس آ
پوچھ مجھ سے حال دل تو اور کچھ اپنی سنا

ہجر کی شب سانس لینا بھی بہت دشوار تھا
خامشی تھی اس قدر تھا حبس ساکن تھی ہوا

تجھ سے بازی جیت کر میں خوش نہیں ہوں آج بھی
ہے مجھے افسوس مجھ کو دوست تیری ہار کا

دل لگی وہ رفتہ رفتہ بن گئی دل کی لگی
چارا گر کیا میرے درد دل کی ہے کوئی دوا

بھول مت جانا کہیں اپنے ہی گھر کا راستہ
اک دیا دیوار پر میں نے جلا کر رکھ دیا

ختم ہو گی کب یہ دوری کب وصال یار ہو
کیا مقدر میں ہی لکھی تھی جدائی کی سزا

کیوں ہوا ہوں دربدر اشفاق اپنے در سے میں
کیا ہوئی تقصیر مجھ سے کیا ہوئی مجھ سے خطا

محمد اشفاق بیگ

غزل

لوگ اک دھیان سے سنتے ہیں فسانہ تیرا
راستے پوچھتے پھرتے ہیں ٹھکانا تیرا

رات بھر شعلے سے منہ زور ہوا لڑتی رہی
جانے کس شوق میں تھا دل کو جلانا تیرا

کچھ نہ پوچھو مرے دل پر جو گزرتی ہے یہاں
دل کی محفل میں عجب تھا کبھی آنا تیرا

میری آنکھوں میں وہ جبرانؔ نظر آتا ہے
دل کی دیوار پہ لکھا تھا ترانہ تیرا

میری سانسوں میں بھی اب نقش کوئی رہتا ہے
جیسے شیشوں پہ دھواں چھوڑ کے جانا تیرا

کچھ اداسی سی تپش ہے تری یادوں میں ابھی
کچھ ہواؤں میں ہے اک زخم پرانا تیرا

کون سمجھائے کہ یہ وقت بھی رک سکتا ہے
جب کبھی دل نے پکارا ہے زمانہ تیرا

کون سی ساعتِ نادیدہ نے بدلا مجھ کو
زندگی نے مجھے لوٹایا بہانہ تیرا

وسیم جبران

غزل

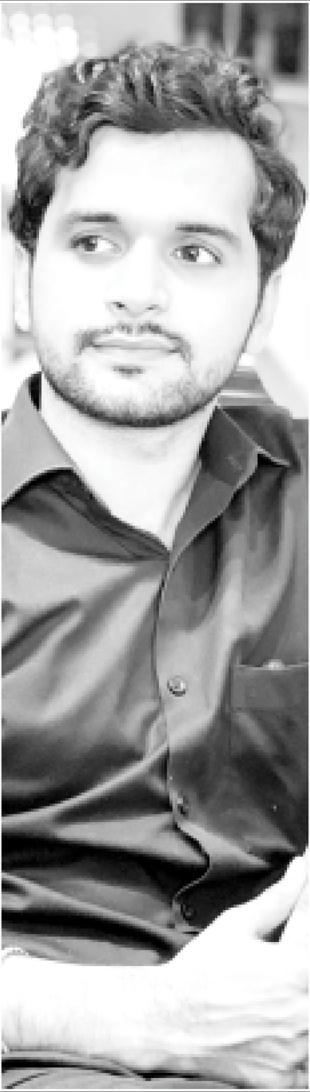

سید تیمور کاظمی

اُسی کہانی اُسی راستے پہ چلتے ہوئے
تھکا ہوا تھا یہ سورج اُفق سے ڈھلتے ہوئے

یہ کون مجھ کو اندھیرے کی سمت لے آیا؟
میں روشنی کے تعاقب میں تھا نکلتے ہوئے

میں اپنے خوف کی دیوار خود گراتا ہوں
کبھی مچلتے ہوئے اور کبھی سنبھلتے ہوئے

وہ روشنی اِسی دریا میں آ کے گرتی تھی
میں جس کو دیکھتا رہتا تھا ہاتھ ملتے ہوئے

یہ رہگزر بھی اُسے میری سمت لے آئی
جسے خبر ہی نہ تھی راستہ بدلتے ہوئے

میں اشکبار ہوا ہوں تو اس پہ حیرت کیوں؟
مجھے دکھائے گئے تھے خیام جلتے ہوئے

وہ آگ اپنی ہی رو میں جلی رہی تیمور
میں اُس کے سامنے بیٹھا رہا پگھلتے ہوئے

غزل

جو لہر دل میں اُٹھی ہے پلٹ بھی سکتی ہے
کہ بات بننے سے پہلے اُلٹ بھی سکتی ہے

نہ دیکھ میٹھی نظر سے اُداس لوگوں کو
پری اداسی کی تہہ سے چمٹ بھی سکتی ہے

اُگی ہے دُکھ کی امربیل جو مرے تن پر
ترے وجود سے آ کر لپٹ بھی سکتی ہے

عجب نہیں ہے کہ وحشت میں رقص کرنے سے
کھنک رہی ہے جو زنجیر کٹ بھی سکتی ہے

مسلسل آنکھ سے آنسو بہانا ٹھیک نہیں
کہ بھیگ کے تصویر پھٹ بھی سکتی ہے

دکھائی دیتا نہیں ہے کچھ آس پاس مگر
مگر فضا میں جمی دھند چھٹ بھی سکتی ہے

نہیں ضروری کہ تفصیل سے بیاں ہو امر
کہانی سسکی میں ڈھل کر سمٹ بھی سکتی ہے

امر مہکی

غزل

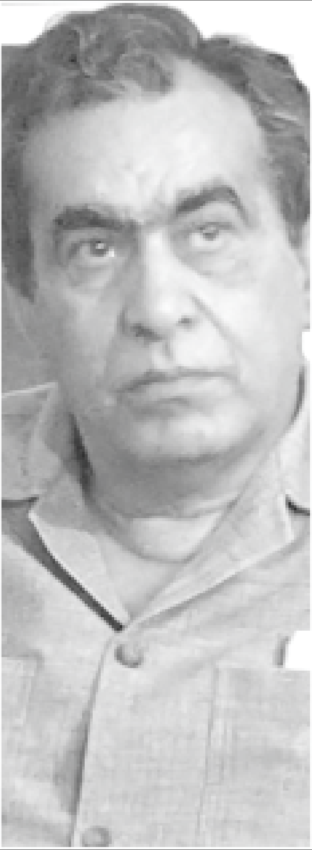

وصال رت میں جو نزدیک سے گزر جاتی
صبا مہکتا گلاب آئنے پہ دھر جاتی

کسی کا چاک گریباں صدائیں دیتا ہے
یہ خاک سر پہ نہ پڑتی تو پھر بکھر جاتی

یہ مانتا ہوں کہ سارا قصور میرا ہے
دعا جو دل سے نکلتی تو عرش پر جاتی

کوئی سوار کبھی گرد سے نکل آتا
سوادِ شہر کو پھر خیر کی خبر جاتی

ہر ایک پل ہمیں اپنا حریف چاہیے تھا
اگر شکست بھی ہوتی تو اس کے سر جاتی

اورنگزیب حسام حر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد مجھے منظور نہ تھا جاں سے گزرنا
گھر بیٹھ رہا باندھ کے پیمانِ وفا میں

غزل

کان بھرنا بھی اک ہنر ٹھہرا
تھا جو بے حیث معتبر ٹھہرا

حال ان پر کھلے گا پھر کیوں کر
صبر ہی جب کہ نامہ بر ٹھہرا

رائگانی کا پوچھتے کیا ہو
میں چلا اور مرا سفر ٹھہرا

خاک میں مل گیا غرور اس کا
اور مرا عجز کارگر ٹھہرا

کارواں کا خدا ہی حافظ ہے
ایک مورکھ ہے راہ بر ٹھہرا

غنچہ شوق کھل نہیں پایا
وقفہ زیست مختصر ٹھہرا

منزلیں بھی گریز پا نکلیں
رائگاں زیست کا سفر ٹھہرا

وہ جو دل کے قریب تھا عاجز
دل کی حالت سے بے خبر ٹھہرا

نوید عاجز

غزل

لہجے سمیت چشمِ تغافل کو بھول کر
خوش ذائقہ بدن کی حماقت قبول کر

مخصوص لے میں آج تجھے گنگناؤں گا
مثلِ صحیفہ قلب و جگر پر نزول کر

رد کر دیا نا تجھ کو محبت نے آخرش
کس نے کہا تھا تجھ سے یہ خواہش فضول کر

پچھلی رتوں کا بار اٹھاتا ہے یہ فقیر
تاوان اس برس کا تو خود سے وصول کر

روتے ہوؤں کو شہرِ مسرت میں چھوڑ آ
ہنستے ہوؤں کو واقفِ رنج و ملول کر

اسد رضا سحر

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں! ہے تری تعبیر کہاں

----- انتخاب -----
- خالد احمد -
نعمان منظور -----

غزل

ڈیرے اپنے مری بستی سے اٹھا رے دریا
اپنی حد میں تو سمٹ جا مرے پیارے دریا

تو جو بپھرا ہوا بستی میں چلا آیا ہے
کس نے توڑے ہیں ترے بند، کنارے دریا

چڑھ گیا ہے در و دیوار پہ سرکش پانی
کوئی آئے جو مرے سر سے اتارے دریا

کوئی آسیب نظر آنے لگا ہے ان کو
چیختے پھرتے ہیں کیوں خوف کے مارے دریا

ان کی تہذیب سے غافل ہیں وطن کے حاکم
پھر رہے ہیں سبھی آوارہ ہمارے دریا

ایک بستی تھی یہاں دریا کنارے احمد
بہہ رہا ہے جہاں دریا کے کنارے دریا

احمد ساقی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بس اک کھٹکا ، بس اک دھڑکا
یاد نہ رکھ لیں ، بھول نہ جائیں

غزل

راجہ عبدالقیوم

اب یہ انساں ہیں سر بسر سائے
جیسے پھرتے ہوں در بدر سائے

سائے ڈھونڈھے ہیں سائے پائے ہیں
ہم نے پائے ہیں عمر بھر سائے

گھر بہ گھر لوگ بستے جاتے ہیں
قریہ قریہ ہیں ، گھر بہ گھر سائے

ساتھ ساتھ ان کے سائے رہتے ہیں
مجھ کو لگتے ہیں بام و در سائے

شہر پہ شہر بنتے جاتے ہیں
ان میں بستے ہیں گھر بہ گھر سائے

اپنے فتنوں کے ہاتھوں مرتے ہیں
فتنہ پرور ہیں فتنہ گر سائے

اصل ان کی کہیں پہ ہے کہ نہیں؟
یہ جو آتے ہیں اب نظر سائے

تم نے جن کو بھی پیڑ سمجھا ہے
وہ ہیں پیڑوں کے بے ثمر سائے

غزل

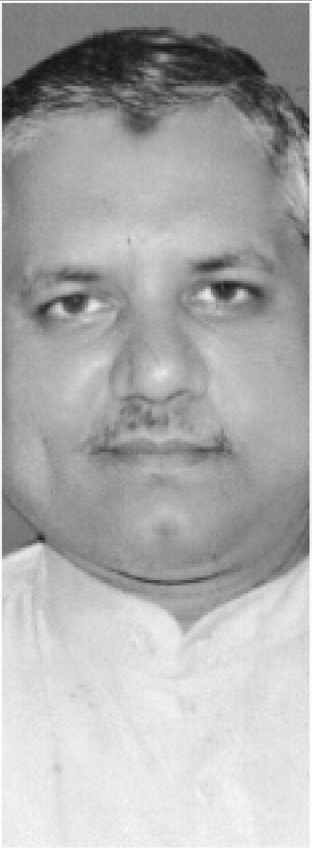

عقیل شافی

یاد نے لی انگڑائی ہے
آنکھ مری بھر آئی ہے

ڈستی ہے جو روز مجھے
وہ میری تنہائی ہے

بھوکی بچی ماں نے رات
ٹرلوں سے بہلائی ہے

خوف نے پنجے گاڑے ہیں
سبھی آج خدائی ہے

جس کو اپنا جان لیا
وہ تو چیز پرائی ہے

شافی مجھ کو ساری عمر
سہنا دردِ جدائی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

غزل

لٹے اب تک نہ کیوں اسباب میرے
بہت بے تاب ہیں بے تاب میرے

مری نیندوں میں جھانکا جا رہا ہے
چُرائے جا رہے ہیں خواب میرے

مَیں اِس برتے پہ آگے بڑھ رہا تھا
کہ میرے ساتھ ہیں احباب میرے

کراچی بھی مجھے راس آگیا ہے
مگر کچھ خواب ہیں پنجاب میرے

مَیں اپنے رقص میں وہ عکس کھینچا
دِوانے ہو گئے گرداب میرے

الگ ہوتا گیا مَیں ہاو ہُو سے
الگ ہوتے گئے آداب میرے

اُٹھی وہ آنکھ نازش! اِس طرح سے
کہ صحرا ہو گئے سیراب میرے

شبیر نازش

غزل

رگ و پے میں کوئی چھالا نہیں ہے
دلِ ناسور کیوں بھرتا نہیں ہے؟

کوئی محرم مرے دل کا نہیں ہے
حقیقت آشنا دِکھتا نہیں ہے

ہمارے حسن کا چرچا نہیں ہے
جہاں میں کوئی بھی بِینا نہیں ہے

تمھیں بھی حسرت عہد طرب ہے
ہماری ذات بھی دانا نہیں ہے

ہماری حسرتیں بجھنے لگی ہیں
جو مانگا تھا، ہمیں ملتا نہیں ہے

ہمارے بخت میں وہ شخص آیا
ہمیں جو اک نظر تکتا نہیں ہے

جسے ہم نے دل و جاں میں بسایا!
ہمیں اس شخص نے سمجھا نہیں ہے

دلِ بسمل سنبھلنا چاہتا ہے
اسے بہلا سکوں، ایسا نہیں ہے

ہمیں مسکان گل زعمِ سخن ہے!
عروضِ عشق پر آتا نہیں ہے

مسکان گل

غزلیں

رسم دنیا ہے ناصر نبھانی تو ہے
مر کے بھی زندگانی بتانی تو ہے

دوستوں سے چھپانا ہیں رنج و الم
مسکراہٹ لبوں پر سجانی تو ہے

کھلکھلاتی ہنسی ، گنگناتی خلش
ہر طرف تیری کوئی نشانی تو ہے

تیری محفل میں گر ذکر میرا چھڑا
آنکھ میں پھر نمی تیرے آنی تو ہے

زندگی ہم نے برباد کر لی، مگر
کم سے کم ایک بار اپنی مانی تو ہے

قیس اپنی جگہ، تیرے ناصر کی بھی
شہر میں ایک اپنی کہانی تو ہے

ناصر شفیع

تیرا غم یوں بھی سینے میں پالے گئے
ہم لبوں سے تبسم اچھالے گئے

کیسے آ پائیں گے باز ڈسنے سے وہ
آستیں میں اگر سانپ پالے گئے

کھل گئے چاند چہروں کے کالے بھرم
آئنے جب فضا میں اچھالے گئے

کیسے خواہش کریں پھر اسی خلد کی
اک بہانے جہاں سے نکالے گئے

بے بسی سے کمر کی پریشاں ہے دل
اتنے غم میرے دامن میں ڈالے گئے

شمع جاں گو ہے بجھنے کو ناصر مگر
ہم ہیں خوش، اس گلی تک اجالے گئے

غزل

اتنی دھیمی تھی وہ آہٹ جس میں یہ دل کھو گیا
چاند جھوٹی سی تسلی دے کے آخر سو گیا

کچھ صداؤں کا یہاں تھا شور اور کچھ میرا دل
میں سنبھلنے کو ہی جاتا تھا کہ یک دم رو گیا

کچھ لگا ہوں میں ترے درشن کی چاہت تھی بس
ایک جھونکا زور کا آیا فنا سب ہو گیا

وہ جو کہتا تھا رہوں گا ساتھ تیرے عمر بھر
مشکلوں کے میم سے گھبرا کے رخصت ہو گیا

دل پہ جب تیری نظر کی تیرگی اتری تو پھر
ایک لمحے میں مرا سارا اُجالا کھو گیا

روشنائی کی طرح پھیلا ہوا تھا دردِ دل
میں نے چُھپنا چاہا جتنا، اتنا ہی کم ہو گیا

زینؔ جب دل کی کتابِ ہجر کھولی رات نے
ہر ورق پر تیرے ہی قصّے کا سایہ ہو گیا

عبدالرؤف زین

غزل

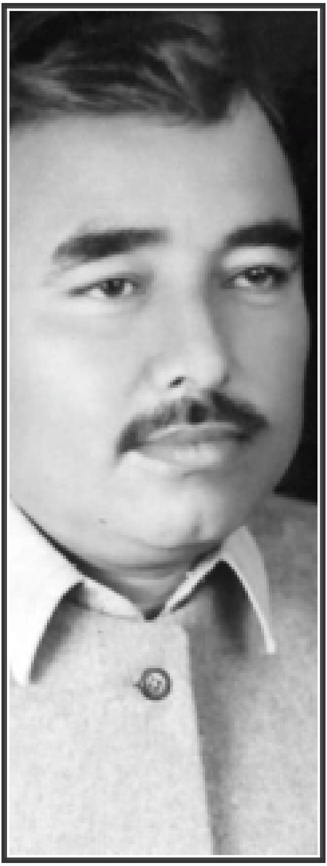

دودھ مکھن پلی ملائی کی
بات کی ، شعر میں کلائی کی

قیدی اچھے تمہیں نہیں لگتے
بات کرتے ہو تم، رہائی کی

بیٹے برباد ہو گئے گھر میں
کیسی پردیس میں کمائی کی

وہ کسی طور ، رہ نہیں سکتا
اس کو عادت ہے خود نمائی کی

گُنگ ہو جاتی ہیں زبانیں سب
نوبت آئے اگر ، گواہی کی

حال دنیا کو دیتے پھرتے ہو
بات عاصم ہے جگ ہنسائی کی

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موت کے ٹھنڈے طاق میں روشن ایک ستارا تھا
عمر بھر اس ہجرت کا منظر، بھول نہ پائیں گے

غزل

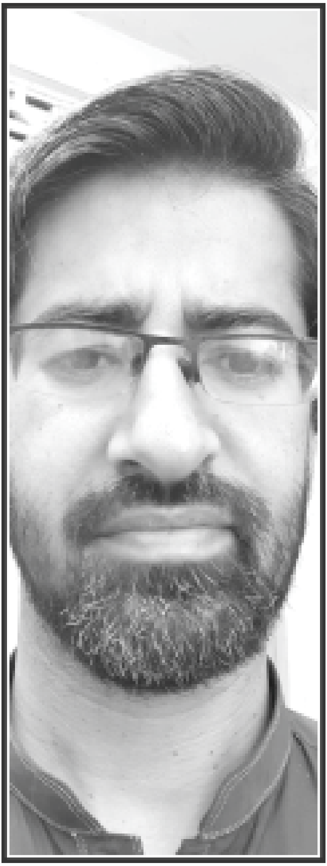

آؤ سب عہدِ وفا مل کے نبھاتے جائیں
اپنے حصے کا کوئی پیڑ لگاتے جائیں

گر ہو فرصت تو ابھی آن ملو تم ہم سے
جاتے جاتے تمہیں ہر بات بتاتے جائیں

تم تو پھر غیر بھلا غیر سے شکوہ کیسا
وقت کے ساتھ اقارب بھی بھلاتے جائیں

ہم کو شاعر نہ سمجھ لینا کہیں غلطی سے
موجِ مستی میں اگر شعر سناتے جائیں

جس نے کانٹے مری راہوں میں بچھائے شاہد
اس کی راہوں میں بھی ہم پھول بچھاتے جائیں

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سب کا ایک مالک تھا، یہ زمین سب کی تھی
یاد ہے خُدا والو، یہ خدا کی بستی تھی

غزلیں

خود سے بے زار کر گیا مجھ کو
غم یہ لاچار کر گیا مجھ کو

دشمنوں سے گلہ کروں کیوں کر
قتل جب یار کر گیا مجھ کو

اِک ترے وصل کا ادھورا خواب
کیسے مسمار کر گیا مجھ کو

خال و خد سب بگڑ گئے میرے
ہجر بیمار کر گیا مجھ کو

آنکھوں میں اشک لب پہ نوحہ گری
دل عزادار کر گیا مجھ کو

اک فقیر آ کے میری چوکھٹ پر
پھر گنہگار کر گیا مجھ کو

دان کر کے وہ درد کی دولت
کتنا زر دار کر گیا مجھ کو

جیت کر وہ بھی خوش نہیں مہدیؔ
شخص جو ہار کر گیا مجھ کو

غضنفر مہدی

اے شبِ تیرگی معافی دے
ہجر کی بے بسی معافی دے

ہر طرف ظلمتوں کے سائے ہیں
حسرتِ روشنی معافی دے

بوجھ لگنے لگی ہیں یہ سانسیں
اب مجھے زندگی معافی دے

دوستی کے ہیں زخم تازہ ابھی
اس لیے دشمنی معافی دے

میں اُسے ایک دن بھلا دوں گا
گر یہ دل کی لگی معافی دے

ہجر سیراب کر گیا مجھ کو
وصل کی تشنگی معافی دے

دکھ تو میراث ہو گئے مہدیؔ
زیست کی ہر خوشی معافی دے

ازالۂ ابہام بسلسلہ راجو قتال

تاریخ میں راجو قتال کے لقب سے متعدد شخصیات کی خبر ملتی ہیں جیسے سید محمد یوسف شاہ الحسینی دہلوی (م ۱۳۳۵ء) معروف بہ راجو قتال۔ خلف شاہ علی حسینی، برادر سید جلال الدین برج الاولیا و سید گل بہار۔ آپ کے چار فرزند ہوئے: سید حسین ملقب شاہ چندن حسینی (مزار والد کے گنبد کے مشرقی بازو میں)، سید محمد گیسو دراز (روضہ گلبرگہ میں)، سید احمد (کمسنی میں وفات پائی) اور سید علی حسین (لاولد) راجو قتال خراسان کے سادات خاندان کے فرد تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے اجداد سلطان علاؤ الدولہ مسعود شاہ غزنوی سوم کے زمانے (۱۰۹۹ء-۱۱۱۵ء) میں ہرات سے دلّی آئے۔ اُس وقت دلّی کی بنیاد رکھے کوئی پچاس برس بیت چکے تھے اور یہ علاقہ راجپوتوں کے تومر خاندان کے زیرِ تسلط تھا جہاں انگا پال کے بعد تیجا پال یا مدنا پال کا دورِ حکمرانی تھا۔

"تحفۃ الکرام" میں میر علی شیر قانع لکھتے ہیں کہ ان کی پیدائش پر سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ قطب عالم (م ۱۴۵۳ء) نے گجرات کے شاہ محمود سے فرمایا "بھائی محمود خوش ہو، اساں تھیں وڈا تساں تھیں وڈا ساڈے گھر جلال جہانیاں آیا"۔ یہ فقرہ شاہ راجو کی بزرگی پر دال ہے۔

راجو قتال خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید اور شیخ ناصر الدین محمود چراغ دہلی کے خلیفہ تھے، بعد میں شیخ ناصر علی الرحمان کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ ان کا شمار چشتیہ نظامیہ سلسلہ میں ہوتا ہے۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانے میں ایک مقبول شخصیت ہو چکے تھے۔ پھر جب سلطان محمد بن تغلق نے پایۂ تخت دلّی سے دولت آباد منتقل کیا تو راجو بھی اپنے خاندان سمیت ۱۳۲۵ء کو خاندان سمیت دلّی سے روانہ ہو کر چار ماہ میں دولت آباد چلے آئے اور خلد آباد کے قریب آباد ہوئے۔

اُن کی تصانیف میں تحفۃ النصائح ایک اہم کتاب ہے جو ۶۹۰ شعروں پر مشتمل ہے اور اسے ۱۲۵ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ ادب

خاور اعجاز

پارہ ایک برگزیدہ ہستی کی خوش گوئی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ راجو قتال نے اس تصنیف میں اپنے بیٹے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے لیے احکام و ارکانِ ایمان سے لے کر رقص و موسیقی تک کے عنوانات کے تحت نصیحتیں جمع کی ہیں۔ موضوعات کا تنوع ظاہر کرتا ہے کہ مصنف کا منشا زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کتاب کی اہمیت اور حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اُس دور کا ''بہشتی زیور'' تھی۔ اس رائے سے مترشح ہے کہ کتاب کے مندرجات اپنے عہد کے معیارات، تہذیب و تمدن اور فکری رویوں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ کتاب کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔ پھر چھ اشعار نعت در حضرت رسالت پناہ محمد مصطفیٰ کی ذیل میں تحریر ہیں جس کے بعد کتاب لکھنے کا سبب بیان کرنے کی غرض سے چند اشعار مرقوم ہیں جس میں نورِ چشم (ابوالفتح خواجہ سید محمد الحسینی) کے لیے نصیحتوں کا تذکرہ ہے۔ انھی اشعار میں اپنے فرزندِ ارجمند کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا اور درخواست ہے کہ وہ اسے ایسا ستون بنا دے جو اپنے علم کے ذریعے دین کے ارکان کو آباد رکھے اور ایسا مالک ہو کہ اس کی مثل کوئی نہ ہو۔ دُوسرے باب میں احکام و ارکانِ ایمان کا بیان ہے یعنی اگر انبیائے کرام دُنیا میں تشریف نہ لاتے اور کوئی شرع بھی جاری نہ ہُوئی ہوتی تب بھی مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا لازم ہوتا۔ اگلے بیان میں زکوٰۃ اور صدقہ وغیرہ کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پھر تلاوت، اذکار اور درود و دعا کے معاملات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ آنے والے ابواب آدابِ جامہ پوشی، خواب و بیداری، خرید و فروخت اور حقوقِ ہمسائیگاں و والدین و فرزنداں پر مشتمل ہیں:

ہر کہ پوشی جامہ نو یک کف پر از آبے بکن
دہ بار سورۂ قدر خواں زاں آب کن آں جامہ تر

کوچہ نگردی نیم شب از خانہ بیروں در مرو
خفتن چو خواہی شمع کس آوند پوش و بند در

تو پیشہ کن خلقے حسن تا اجر یابی بے عدد
با خلق چنداں خُلق کن تا تو نگردی مشتہر

....

اس آخری شعر میں فرمایا کہ اچھے اخلاق اپنا تا کہ اللہ تعالیٰ سے بے حساب اجر پائے۔ آخری ابواب قرض اور اُدھار، عبادات، صبر و شکر، توبہ و زہد وغیرہ کے بارے میں ہیں:

ہرگز ندارد کس روا وامے کشیدن جز سہ جا
در مخمصہ بہرِ کفن تزویج دختر یا پسر

....

یعنی کسی سے ہرگز قرض نہ لے سوائے بھوک، کفن دفن یا اولاد کی شادی کے لیے۔

صوم و صلوٰۃ و صدقہ ہم بہرِ خدا خالص کنی نے
بہرِ جنت حور نے بہرِ خلاصی از سقر

....

یعنی نماز روزہ اور صدقہ اللہ کے لیے خالص کر نہ کہ جنت یا حور یا دوزخ سے نجات کی خاطر۔

فرحت چو خواہی دائما ہمدم بسازی صبر را
ہرگز نہ دیدم در جہاں از صبر چیزے خوب تر

....

یعنی اگر آرام چاہیے تو صبر کو ساتھی بنا کیونکہ صبر سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

توبہ بکن امروز تو ہرگز مگو فردا کنم
شاید بمیری صبح دم فردا نیابی اے پسر

....

یعنی آج توبہ کر، یہ نہ کہہ کہ کل کروں گا، شاید تو مر جائے اور صبح سانس تک نہ لے پائے۔ کتاب کا اختتام مناجات بجناب باری تعالیٰ پر ہوتا ہے:

یارب مرا گرداں چناں از راہ لطف و مرحمت
مسکیں شمارم اغنیا شاہاں نیارم در نظر

....

یعنی اے اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھے ایسا بنا دے کہ غریب کو غنی شمار کروں اور شاہوں کو نظر میں نہ لاؤں۔ غرضیکہ ممکنہ حد تک کتاب زندگی کے متعدد پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب کا فارسی نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر کراچی میں موجود ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلے شاعر قطب زاری نے اپنے مرشد شاہ ابوالحسن فخرآبادی (متوفی ۱۶۰۱ء) کی فرمائش پر ۱۶۳۵ء میں دکھنی زبان میں منظوم ترجمہ مکمل کیا۔ ابوالحسن، حضرت بندہ نواز کی اولاد میں ہیں۔ بیجاپور میں آپ کی بڑی شہرت تھی اور ابراہیم عادل شاہ اور محمد عادل شاہ دونوں آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ شاہ صاحب زہرہ پور میں فخرآباد کے نام سے ایک موضع آباد کر کے وہاں متوطن رہے اور وہیں مدفون ہوئے۔ اسی رعایت سے فخرآبادی کہلاتے ہیں۔

سید صدر الدین راجن قتال سہروردی (۱۳۳۰ء - ۱۴۲۴ء) سادات بخارا سے تعلق ہے۔ سید جلال الدین سرخ پوش کے پوتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید احمد کبیر سہروردی اور ظاہری و روحانی علوم اپنے برادر بزرگ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے حاصل کیے۔ بہت سے غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا جن کی تعداد دو ہزاروں میں بتائی جاتی ہے۔ اگرچہ ان کا لقب راجن قتال ہے لیکن یہ راجو قتال کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ راجن (یعنی بادشاہ) کا لقب روحانی طور پر لوگوں کے دلوں پر حکمرانی اور قتال کا لقب مخالفتِ نفس اور دشمنانِ اسلام سے لڑائی کے سبب ہے۔

محمد عبدالصمد قاضی راجا (۱۳۸۷ء - ۱۴۵۵ء) حسن گنگوہمنی کے بیدر کو اپنی سلطنت کا جزو بنانے سے قبل یہاں عماد الملک ظفر خاں علائی اور تصرف خاں کی حکمرانی تھی۔ قاضی راجا کا تعلق دلی کے قاضی خاندان سے تھا۔ حنفی المسلک تھے اور گلبرگہ کے مشہور علمائے اسلام میں

تھے۔ بندہ نواز کی گلبرگہ آمد پر ان سے ملاقاتیں رہیں اور اس قدر متاثر ہوئے کہ دربار سے استعفیٰ دے کر خواجہ موصوف کی بیعت سے مشرف ہوئے اور علمِ حدیث اور ذکر و فکر میں مشغول ہو کے اُن کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوئے۔ پھر جب سلطان علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی نے اپنا صدر مقام گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا تو یہ بھی بندہ نواز کے نواسے خواجہ ابوالفیض نیز سید عبداللہ مغربی (م ۱۴۷۸ء) اور شاہ ولی اللہ حسینی کی ہمراہی میں بیدر تشریف لائے اور یہیں مدفون ہوئے۔ قاضی راجا کے والد محمد عبدالقادر بہمنی دربار میں صدر جہاں (شیخ الاسلام) کے عہدہ پر فائز رہے جن کی وفات کے بعد فیروز شاہ بہمنی نے یہ منصب آپ کو تفویض کیا۔ تعلیم اور عدل کے محکمے بھی آپ کے سپرد تھے۔ صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔ شاعر بھی تھے۔ ''زلفِ الہام'' کے نام سے ان کا دیوان موجود تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے مرید و خلیفہ تھے۔ بیدر میں شاہ راجو قتال کے نام سے غلط العام مشہور تھے۔

سید محمد علی راجن الحسینی البخاری (۱۴۹۵ء-۱۵۳۴ء) عرف راجو بخاری۔ خلف سید حامد الحسینی عرف بڈھا۔ شجرہ نسب امام علی نقی تک پہنچتا ہے۔ مزار لیہ میں ہے جسے ہمایوں بادشاہ نے ۱۵۵۴ء میں تعمیر کروایا اور اکبر بادشاہ نے ۱۵۶۸ء میں دوبارہ تعمیر کرایا۔

شاہ راجو (متوفی ۱۲۸۲ء) بھی گیسو دراز کے خاندان سے تھے اور قطب شاہی خاندان کے آخری حکمران ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد تھے۔

اس کے علاوہ قتال کا لقب کچھ اور بزرگوں سے بھی منسوب ہے جیسے مخدوم شاہ صدر الدین قتال (۱۲۳۸ء-۱۳۷۹ء) خلف مخدوم عبدالرشید حقانی۔ ہاشمی سادات میں تھے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ بعد ازاں مخدوم بہاالدین زکریا اور لعل شہباز قلندر جیسے اولیاؒ کی صحبت میں رہے۔ مزار تحصیل دنیا پور سے دس کوس کے فاصلہ پر واقع گاؤں قطب پور میں ہے۔ آپ کے بھائی مخدوم حسن قتال اور بھتیجے مخدوم سلطان ایوب قتال کا شمار بھی بزرگانِ دین میں ہوتا ہے۔

مخدوم سید سلطان ایوب قتال (م ۱۳۶۵ء) برِ صغیر میں سلسلۂ قادریہ کے بزرگ مخدوم عبدالرشید حقانی کے پوتے ہیں۔ سادات بنی ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں۔

شیخ یوسف قتال (۱۴۵۱ء-۱۵۲۷ء) قاضی جلال الدین لاہوری کے مرید اور داماد تھے۔

مندرجہ بالا گذارشات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ راجو قتال کا لقب بنیادی طور پر سید محمد یوسف شاہ الحسینی دہلوی کی ذات سے منسلک رہا اور باقی تمام حضرات کے لیے بعد ازاں مستعمل ہوا۔

☆☆☆☆☆

ادب ادیب اور اسلام عظمی [1961 سے شروع ہونے والا ادبی سفرنامہ] (قسط چہارم)

اسلام عظمی

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں --- کی بات میں نے اس تناظر میں کی ہے کہ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے اور مشرق حقے کی نڑی گڑگڑاتا رہ گیا ہے۔ اقبالؒ پیش گوئی کی تھی --- احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات - آلات تیزی سے انسانی امور سنبھالتے جا رہے ہیں - کارخانوں اور فیکٹریوں کا کنٹرول سیکڑوں کوس دور کے غیر مرئی ہاتھوں میں بتدریج منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ جب اہل نظر کہیں دور جا کر تازہ بستیاں آباد کرلیں گے تو مال روڈ نامی سڑک پر واقع پاک ٹی ہاؤس بھی پہلے سا نہیں رہ پائے گا۔ ناصر کاظمی اگر آج کے لاہور میں ہوتا اور رات گئے پاک ٹی ہاؤس سے گھر لوٹتے ہوا کیا یہ شعر لکھ پاتا۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

....

گاڑیوں کے ہارنوں کے شور میں ہو بچو ہو بچو کا شور قصہ پارینہ بن چکا۔ یہ کہانی نئی نہیں ہے۔ قدیم سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ بہت پہلے بھی بدلاؤ کی رفتار سے چونک کر کوئی

بولا تھا۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی --- تو ایسا کہنے سے یا ایسی حیرتی سے بدلاؤ کا عمل رک گیا تھا؟ نہیں رکا تھا۔ یہاں پر ایک پرانا قصہ یاد آ گیا ہے۔ سن لیجیے۔

تھیوری کا امتحان پاس کر لینے کے بعد سٹیشن ماسٹر سے زبانی سوال جواب ہو رہے تھے۔ پوچھا گیا۔

سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہے اور غلطی سے اسی ٹریک پر ایک اور گاڑی کو داخلے کے لیے گرین سگنل دے دیا گیا ہے۔ یہ خبر پر تم کیا کرو گے۔

سگنل اپ کروا دوں گا۔

سگنل اپ کروانے کا وقت نہیں ہے۔ تم کیا کرو گے؟

میں خود سرخ جھنڈی لے کر ادھر کو بھاگنا شروع کر دوں گا جدھر سے ٹرین آ رہی ہے۔

اتنا بھی وقت نہیں ہے۔ تم کیا کرو گے؟

پھر میں چلا کر آس پاس کے لوگوں کو بتاؤں گا۔ بھاگ کر آؤ۔ لائیو ایکسیڈنٹ دیکھنے کا موقعہ شاید پھر نہ مل سکے۔

عام آدمی کی زندگی دن بدن مشکل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ایسے میں کتاب سچا ساتھی بنتی ہے۔ حسب حال شاعری میسر ہو جائے تو آدمی خوشحال ہو جاتا ہے۔ اعصاب پر سکون ہو جاتے ہیں۔ بار دگر اقرار کر لوں کہ سوائے شفیق سلیمی میں لکھاریوں کو ان کی لکھتوں ہی سے جانتا پہچانتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ کوئی جب یہ کہتا کہ کسی شاعر کے زندہ رہنے کے لیے اس سے ڈھنگ کا ایک شعر بھی سرزد ہو جانا کافی ہے تو میں مذاقاً یہ کہتا --- ڈھنگ کے دو شعر بھی ہو جائیں تو بھی کیا مضائقہ ہے؟ تجربہ یہ کہتا ہے کہ دل پر نقش ہونے کے لیے شعر کا حسب حال ہونا اہم ہے۔

نجیب احمد پیارا محبتی آدمی تھا اور اس سے تعلق کا سبب خالد احمد تھا۔ نجیب احمد کے یہ شعر مجھے ہانٹ کرتے تھے اور کرتے رہیں گے۔

جنوں پہ رخصتی کی رسومات قرض تھیں
پاگل ہوا کے ہاتھ میں شہنائی آ گئی

وہ قوس قوس مجھ کو اندھیروں میں یوں ملا
ہاتھوں کی پور پور میں بینائی آ گئی

....

منظر نامہ ایسا کہ پوری عمر گنگناتے رہو مگر تشنگی ہی رہے۔

کھلنڈرا سا کوئی بچہ ہے دریا
سمندر تک اچھلتا جا رہا ہے

....

صابر ظفر کا یہ شعر بھی یادداشت سے چپکے لپٹا ہی

رہا۔ ہر تیسرے ملنے والے کو سنایا۔

ڈول جائیں گے ترے بازو ترازو کی طرح
اور تیرے سامنے نیلام ہو جائیں گے ہم

یہاں قیوم طاہر یاد آگیا۔ اس سے متحدہ عرب امارات میں ملا تھا۔

تھک کر تیرے گر جانے کا رنج نہ اتنا ہوتا
اچھا ہوتا گھر سے میں جو تنہا نکلا ہوتا

....

میں اوروں کے بارے میں کوئی فتویٰ جاری نہیں کر سکتا۔ مگر کسی کا کوئی شعر مجھے پسند آجائے تو میرے لیے وہ شعر حرف آخر ہو جاتا ہے۔

کشید میں حسین مجروح کا یہ شعر دیکھیں۔

جھولا پڑا نہ چھاؤں میں بیٹھا کوئی فقیر
شیشم کا پیڑ شہر میں بے آبرو ہوا

....

یہ سب شعر بھی ہیں اور کہانیاں بھی۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ یاد آیا کہ انیس سو ستر کی دہائی میں امرتسر سے ٹیلی ویژن کی نشریات شروع ہو گئی تھیں اور وہاں سے پاکستان سے انڈیا جانے والی ادبی شخصیات کا انٹرویو نشر کیا جاتا۔ افتخار عارف جو ان دنوں پاکستان ٹیلی ویژن کے کسوٹی پروگرام میں عبیداللہ بیگ کے ساتھ شرکت کرتے تھے، انڈیا گئے تو اُن کا انٹرویو بھی پیش کیا گیا۔ آگے چلنے سے پہلے اس سے پہلے یہ بات کیوں نہ بتا دی جائے کہ مرد سے اُس کی تنخواہ اور عورت سے اُس کی عمر پوچھنا غیر مہذب سوالات ہیں۔ مگر انٹرویو کرنے والے افتخار عارف سے سوال کر ڈالا۔

افتخار عارف!

آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟

افتخار عارف جتنا ٹیلی ویژن پر نظر آتا تھا، اتنا سیدھا بہرحال نہیں تھا۔ اس نے اپنی تنخواہ بتانے کے بجائے اُلٹا سوال پوچھنے والے سے اُس کی تنخواہ پوچھ لی۔

یہی کوئی دو ہزار روپے۔

دو ہزار روپے میں اپنے گھر کا کرایہ دیتا ہوں۔۔۔ افتخار عارف نے مسکرا کر جواب دیا۔

یہ جواب دراصل ہور چوپو کی طرح کا تھا۔ سوال پوچھنے والا لاجواب ہو گیا۔ مجھے افتخار عارف کی ذہانت اچھی کیا بلکہ بہت اچھی لگی۔ کچھ ہفتے یا مہینے پہلے انھی صاحب نے اقبال ساجد کا انٹرویو کیا تھا اور اقبال ساجد سے اپنا کوئی پسندیدہ شعر سنانے کی فرمائش کی تھی۔ تب اقبال ساجد نے یہ شعر سنایا تھا۔

ہزاروں زلزلے جس کے فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

....

شعر اچھا تھا اور ہے - خوب صورت تھا- خیال آور تھا- مگر موقعہ محل غلط تھا- مجھے دشمن ملک میں جا کر یہ شعر پڑھنا اچھا نہیں لگا تھا- فرق شاید تربیت اور تعلیم کا تھا- میری عمر کے اکثر لوگوں کو رسالہ تعلیم و تربیت منہ زبانی یاد تھا مگر---افتخار عارف نے ایک بار پی ٹی وی کے لیے پروین شاکر کا انٹرویو کیا- ایک سوال کم و بیش اس طرح کا تھا-

پروین، تمھاری شاعری کے بارے میں کچھ لوگوں کو تحفظات ہیں-

پروین شاکر نے جواب دیا-

تحفظات ہیں بھی تو کیا! میری شاعری اچھی ہے- ہاں کبھی کبھار خوش خطی کے پانچ نمبر اضافی مل جاتے ہیں-

کیا بات ہے خوش خطی کے لفظ کے استعمال کی- لفظ خوش خطی کا اس سے بہتر استعمال شاید ہی کسی نے دیکھا ہو- شہرت خداداد ہے مگر کچھ خوبی کا بھی ہاتھ ہوتا ہے- پروین شاکر مقبول شاعرہ تھی- العین میں بھی اپنا کلام سنایا تھا- مشاعرہ گاہ یعنی ہلٹن ہوٹل سے نکلتے ہوئے میں نے امجد اسلام امجد کے ساتھ اس کی تصویر بھی کھینچی تھی- سال دو سال کے بعد آدھی رات کو کسی شخص کا مجھے فون آیا-

عظمی صاحب ، پروین شاکر ایک روڈ ایکسی ڈنٹ میں جان گنوا بیٹھی ہیں-

شاعری اچھی شاعری مداحوں کو شاعروں کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے- پروین شاکر کا تذکرہ ہو اور اس کا یہ شعر نہ دہرایا جائے تو یہ تحریر پڑھنے والوں کے ساتھ زیادتی ہے-

کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

....

المیہ ہے کہ پروین شاکر کی ازدواجی زندگی کا اختتام خوشگوار نہ رہا- روایات کے مطابق حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا- مگر آدم کی کچھ اولاد و پسلی توڑ ہی رہی- مگر پھر وہی گھسی پٹی بات کہ یہی تو ہے زندگی- ابوظبی میں ایک دوست نے کہا-

عظمی صاحب- یہ جو پروین شاکر ہے اس کی شاعری دراصل اس کے نانا کی شاعری ہے- وہ اپنے نانا کی بیاض سے استعفادہ کرتی ہے-

میں نے جواب دیا-

لگتا ہے کہ پروین شاکر کے نانا جی بڑے بھولے بھالے تھے - ایسی خوب صورت شاعری اپنے نام سے نہیں چھپوائی اور نواسی کے لیے چھپا کر رکھی-

ایسی باتیں نادان لوگ کرتے ہیں- ایک استاد

اور شاگردوں کے بارے میں ایک ثقہ بندے نے بڑی ہلکی بات کی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور لاحول پڑھنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ افتخار عارف کی شاعری سے مجھے متعارف حیدر قریشی کے رسالہ جدید ادب میں چھپے مضمون نے کروایا تھا۔ حیدر قریشی یہ رسالہ خانپور ضلع رحیم یار خان سے شائع کرتے تھے۔ پھر جرمنی چلے گئے۔ مزے کی بات ہے کہ ابوظہبی میں لاہوریے سیالکوٹیوں کو جرمن کہتے تھے اور سیالکوٹیوں کے بارے میں ایک جگت گھڑی ہوئی تھی جو میرے پاس کراچی کے (مرحوم) اظہار حیدر کے ذریعے پہنچی تھی۔ اظہار حیدر بلدیہ ابوظہبی میں چیف انجنیئر تھے۔

سیالکوٹی نے لاہوری سے پوچھا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ لاہور کی پہچان کون سی شخصیت ہے؟

علامہ اقبال۔۔ لاہوری کا جواب تھا۔

سیالکوٹی نے کہا۔ شاید تم نہیں جانتے کہ علامہ اقبال پیدا سیالکوٹ میں ہوا تھا۔

تو کیا! لاہور آ کر علامہ اقبال بنا۔ سیالکوٹ میں رہتا تو فٹ بال سی کر ہی مر جاتا تھا۔

علامہ اقبال کی پہچان ایران اور عرب دنیا میں اقبال لاہوری ہی ہے۔ میرا پہلا شعری مجموعہ اڑانوں کا ہرا موسم شائع ہوا۔ ایک ساتھی صومالی انجنیئر نے دیکھا تو کہنے لگا۔

ایک نسخہ جمال سلیمان کو بھی دے دو۔

وہ تو تمھاری طرح عرب ہے اور یہ اردو شعری مجموعہ ہے۔

تم دے آؤ۔ اچھا ہوتا ہے۔

میں نے اپنے شعری مجموعہ اڑانوں کا ہرا موسم جمال کا ایک نسخہ جمال سلیمان کو دے دیا۔ وہ بلدیہ العین کا ڈرینج انجنیئر تھا۔ کبھی میں اس کے کمرے میں جاتا اور کوئی اور شخص اس کے پاس بیٹھا ہوتا تو فوراً اپنی دراز سے میرا شعری مجموعہ نکال کر اسے دکھاتا اور بتاتا۔ عبدالسلام شاعر مثل اقبال لاہوری۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ عرب دنیا کی مقبول ترین اور عالمی شہرت یافتہ مغنیہ ام کلثوم نے علامہ اقبال کے کلام میں سے نظم شکوہ اور جواب شکوہ کا عربی ترجمہ گا کر اقبال لاہوری کا تعارف عرب دنیا سے کروایا تھا۔

بات ہو رہی تھی افتخار عارف اور پروین شاکر کی۔ مشفق خواجہ کی تحریر بے مثال تھی۔ کاٹ دار جملے ہوتے تھے۔ ان دونوں کے حوالے سے ان کی ایک تحریر یاد آئی۔ مگر مضمون طوالت پکڑ گیا ہے۔

[جاری ہے۔]

ابدال بیلا! تمھیں یاد کرتے رہیں گے

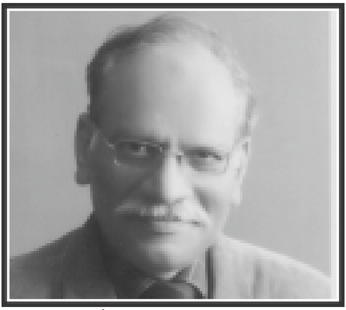

اک دن بک جائے گا ماٹی کے مول
جگ میں رہ جائیں گے پیارے تیرے بول

دوجے کے ہونٹوں کو دے کر اپنے گیت
کوئی نشانی چھوڑ، پھر دنیا سے ڈول

....

جن لوگوں کے فرائض منصبی چیتے کی طرح وقت کے غزال کو نگلنے کے عادی ہوں، معلوم نہیں وہ لکھنے پڑھنے کے لیے یکسوئی کیسے تلاش کر لیتے ہیں؟ ڈاکٹر ابدال بیلا سے ایک زمانہ یاد اللہ رہی، اس کی نیچر آف جاب ایسی تھی جس میں بظاہر فرصت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سکہ بند فوجی؛ پہلے نیوی میں تھا؛ پھر بری فوج میں آ گیا۔ ایم۔بی۔بی۔ ایس ہونے کے کارن یہی گمان گزرتا تھا کہ میڈیکل کور کا آدمی ہو گا لیکن بارہا اس کی انتظامی ڈیوٹی بالکل مختلف فیلڈ میں لگتی رہی۔ حتیٰ کہ ایک عدد مارشل لا بھی اسے بھگتانا پڑا۔ تب اسے چھیڑ دیا کرتا تھا: 'کوئی بات نہیں بائیں شانے پر براجمان فرشتے نے بھی آخر اپنی رپورٹ سب مٹ کرانی ہے!'

اس آرمی مین ڈاکٹر کے اصل مضامین جرنلزم اور ہسٹری تھے چنانچہ سرکاری کرمچاری ہونے کے باوجود کالم لکھتا رہا۔ تاریخ سے اس کا لگاؤ ہر تحریر میں جھلک دکھاتا ہے۔ اس کے افسانوی مجموعوں: سن فلاور، رنگ پچکاری، زیرلبی، انہونیاں کے مطالعے سے نئے قاری کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہر سطر کئی زمانوں کی زمین کو محیط ہے۔ پھر 'پاکستان کہانی' میں تو یہ کھل کر سامنے آیا۔ داستان ایسی ہوشربا کہ محویت فراغت کی ایک ساعت مستعار نہ لینے دے۔ حقیقت ایسی بے رحم کہ سخت دل بھی اشکوں کو آنکھوں کی جھیلوں میں قید نہ رکھ سکیں۔ اس کے بعد بیلا معتکف ہو کر نہیں

جمیل احمد عدیل

بیٹھ گیا۔ اس کی نوکری ایسی نہیں تھی جو اسے چھٹی مل جاتی۔ دن کو کام کرتا رہا اور پندرہ برسوں پر ممتد راتوں میں قلعہ بند ہو کر رہا۔ ریسرچ ورک میں یہ زیادہ خرچ ہوا اور لکھنے میں کم صرف ہوا، پھر بھی جب اٹھا تو اس کے دامن میں اٹھارہ سو صفحات پر پھیلا ایک ضخیم ناول تھا ــــ 'دروازہ کھلتا ہے' ــــ یہ ناول کیا ہے؟ تا حدِ نظر طلسمات اگے ہوئے ہیں؛ واقعات ایسے کہ حیرتوں کا نئے سے نیا جہان سامنے آئے چلا جاتا ہے!

بیلا جب ملازمت سے سبکدوش ہوا تو اکادمی ادبیات کے فخر زماں نے اسے فوراً اچک لیا اور مذکورہ ادارے میں کلیدی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ یہ کاما (workaholic) وہاں پہنچتے ہی اپنے کام میں جٹ گیا۔ اگرچہ اکادمی میں اس کا قیام زیادہ دیر نہیں رہا لیکن اپنا لکھنا پڑھنا زیادہ توانائی کے ساتھ جاری رکھا۔ نثر کے پہلو بہ پہلو نظم کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا: عرضی، لب بستہ اور بوندا باندی ــــ قارئین چونک اٹھے! کیا صف اول کا یہ فکشن رائٹر کوی بھی ہے؟ سچی بات! ہمیں خود خبر نہ تھی ــــ مگر ان تین کتابوں کو نثر کے شیلف میں تو نہیں رکھا جا سکتا۔ یہاں یہ اعتراف بے محل نہ ہو گا کہ اس کا تمام تر نثری سرمایا شعریت سے ممزوج ہے۔

اپنے طرزِ احساس کو تحقیقی سطح پہ Poeticize کرنا جس قدر اس نثر نگار کو آتا تھا، کم معاصرین ہی اس ہنر میں یکتا ہوں گے۔ طبعِ موزوں محض اوزان و بحور کے ذریعے ہی اپنے ہونے کی شہادت فراہم نہیں کرتی۔ ایک سچ کا نام Poetic Vision بھی ہے اور ابدال بیلا کی رگوں میں لہو نہیں شعری حسیت گردش کرتی تھی۔ یادش بخیر! بعض نقادوں نے اس کی نثر کے متذکرہ پہلو کو بطور عیب نشان زد کیا تھا۔ بس بیلا کا اپنا انداز تھا اور ہر مصنف کا اپنا ایک انداز ہونا بھی چاہیے۔

(مرحوم) ممتاز مفتی کی رفاقت نے اپنے اس خاص الخاص شاگرد کو مجاز سے حقیقت کی طرف ذاتی نگرانی میں سفر کرایا۔ 'سفر اندرِ وطن' سے منسوب یہ کہانی بیلا ہی نے اشاروں اشاروں میں بتائی تھی۔ یہ تجربہ کیا ہوتا ہے؟ اس کی بابت وہی لب کشائی کرے جو اس فیلڈ کا آدمی ہو۔ ہمیں اس بھید/بھیتر کو Unfold دیکھنے/کرنے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ سو، گرو نے کیا دیا؟ چیلے نے کیا پایا؟ ان سرتوں سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں۔ چاہے کوئی چنری ڈھلکائے یا نقاب سرکائے؛ جس منزل کی جانب گامزن نہیں ہونا؛ اس کا راستا پوچھنے سے کیا حاصل! کیا کریں مابعد الطبیعیات کا گورکھ دھندا اپنی اور نہیں کھینچتا۔ زمینی زندگی بے حد اکل کھری سچائی ہے، اسے فیس کرنا پڑتا ہے۔ رشی منی کی مہیا کردہ ہر آسمانی خوش گمانی کو خارج کر کے۔ ہمیں تو مسحور کر دینے کی

کلا میں طاق داستان گو بیلا پسند تھا۔ یوں اس کی سیر روحانی کی کتھا کو بھی فکشن سمجھ کر لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس کے نظمیہ متون سے بھی وہی حظ کشید کیا، جو قصہ کہانی سے دستیاب ہوا کرتا ہے۔

بیلا کی محولہ تینوں کتب میں 'بوندا باندی' شاید سب سے اہم نظموں کی ترجمان قرار پائے۔ مختصر نظموں کی اپنی تاثیر اور طویل نظموں کا اپنا حُسن! اس مجموعے میں شامل ایک نظم 'البم' پچیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح 'راز فاش' نے سترہ صفحے گھیر رکھے ہیں۔ اسے بھی حقیقت کہیے کہ بیلا کے نظمیہ پیکروں کی طرف بہت کم توجہ مبذول ہو سکی۔ قارئین بھی تھوڑے ملے، نقادوں نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ایک عام خواندہ کی حیثیت سے خاکسار کی یہی رائے بنی تھی کہ ابدال بیلا نے ہیئت اور موضوع ہر دو اعتبار سے اپنے لیے الگ جادے چنے ___ بلکہ یہ جادو بھرے جادے اس نے خود ایجاد کیے۔

اتنے برس بیت جانے کے علی الرغم ہمارا اب بھی یہی تاثر ہے کہ ان نظموں کی خواندگی کے دوران جدت پسند ان میں مضمر لذت پر سو جان سے لہلوٹ ہوں گے، بہت امکان ہے کہ رجعت پسند اس بغاوت پر چیخ پا ہوں گے: میاں! چنے چبا لو یا شہنائی بجا لو ___ مگر کوئی ان پر توجہ بھی تو دے! کیا عجب جب یہ نظمیں ارتکاز کے عدسے تلے آئیں تو قدامت پسندوں کی مزاحمت ہی نئے لکھنے والوں کے لیے انھیں آئیڈیل بنا ڈالے! ادبی دنیا میں مسترد ہونے والے 'پیٹرن' بعض اوقات ایسی قبولیت پا جاتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے!

ابدال بیلا بنیادی طور پر جزئیات نگاری کی صفت سے متصف تھا۔ خارجی ماحول کو فوٹوگرافک میموری یا قوت مشاہدہ کے زور پر Capture کر لینا بھی ایک کمال ٹھہرا اور یہ آرٹ کم لکھنے والوں کو ودیعت ہوا۔ اگرچہ کچھ کاریگر ناول نگاروں نے اسے 'کرافٹ' کے قریب کر دیا لیکن بیلا نے اس ہنر میں سے تخلیقیت کو منہا نہیں ہونے دیا۔ اس کا مابہ الامتیاز یہ رہا کہ وہ داخلی رو کی نازک اور پیچیدہ کیفیت کو بیانیے کی بافت میں شامل کر لیتا تھا۔ اپنے اسی جوہر کو اس نے نظم میں بھی برتا۔ 'بوندا باندی' کی نظموں میں اس شاعر نے نقطۂ عروج کو یوں مس کیا کہ بعض اوقات قاری سوچ میں پڑ جاتا ہے، اب اس سے آگے کیا ہو؟!؟ کہیں کہیں تو اس کی نظمیہ سطریں Star Shooting کی شکتی سے معمور محسوس ہونے لگتی ہیں، جو ذات کے آفاق کو آناً فاناً منور کر دینے کا پوٹینشل رکھتی ہیں ورنہ Such As ان کا عمود سہنا شاید مشکل ثابت ہوتا۔ ان نظموں کی خاص لائنوں کو شعاعوں کے رقص ہی کی حیثیت سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ پتھریلے شعلے سوچ کی زمین پر سیدھے آ رہتے تو ممکن ہے پاتال میں خوابیدہ

ذروں کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیتے۔
ابدال بیلا نے اسی لیے تو خاکستر کر دینے والی توانائی کو 'بوندا باندی' کے عمل میں محجوب کر کے پیش کرنا چاہا ہوگا تاکہ جینے والوں سے ان کا ادراک/شعور چھینا نہ جائے - وہ اپنے محسوسات کے مدار میں خود کو محفوظ خیال کر کے متن اور بین المتن سے مربوط ہونے کا وسیلہ تلاش کریں۔
اس راقم عاجز کو 'البم' اور 'راز فاش' کے ساتھ ساتھ جن نظموں نے خاص طور پر اپنے حصار میں لیا تھا، وہ ہیں: سفید گلاب، اگلی بارش کا انتظار، ملن کی رات، پروں پہ موم، میرا گرو، اور منصور حلاج ___ 'بوندا باندی' کو کوئی بھی نظم زور صرف کر کے پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی، جیسے خوش رنگ تتلی کو اپنی تعریف کرانے کے لیے کسی کی سماجت نہیں کرنی پڑتی- بیلا کی نظم بلاواسطہ وجدان کے آنگن میں اتر آتی ہے ___ یہاں عمداً کسی نظم کا ٹیکسٹ درج نہیں کیا گیا تاکہ قاری کتاب کے اوراق سے ذاتی سطح پر رابطہ قائم کرے۔

بیلا کی رحلت بلاشبہ ایک صدمہ ہے! یہ دکھ بھری خبر ملتے ہی ذہن میں یادوں کی ایک ریل سی چل پڑی ہے، بغیر کسی خاص ترتیب کے بہت کچھ سامنے آتا جا رہا ہے- کبھی اس کے افسانوں نظموں کی جانب دھیان جانے لگتا ہے، کبھی اس کی بے حد خلیق شخصیت ذہن پہ غلبہ پانے لگتی ہے۔
مجھے یاد ہے نوے کے دہے کا آغاز ہی ہوگا، جب ابدال بیلا سے تعلق تعارف کی صورت بنی تھی- ایک روز ڈاک میں اس کی چند کتب ملیں؛ ساتھ خط بھی تھا؛ جس میں وضاحت تھی کہ تم سے رابطہ کرنے کی وجہ مفتی جی (ممتاز مفتی) کا حکم ہے! تب ممتاز مفتی سے خط کتابت، بحث مباحثہ عروج پہ تھا- یہ ان کی خاص توجہ اور خاص انداز تھا کہ اپنے نظام شمسی سے جذبی رشتہ رکھنے والوں کو باہم ناتے کے مواقع مہیا کیا کرتے تھے۔
یوں تھوڑے ہی عرصے کے بعد بیلا مجھے ڈھونڈتے ہوئے آ گیا- میں گھر پہ نہیں تھا- کسی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا- ایک قصبے میں کسی کی تلاش کوئی ٹاسک تو نہیں، یوں یہ وہاں آن پہنچا- اس کے بعد جو رفاقت قائم ہوئی تو اب تک چلی- بالمشافہ ملاقاتیں، فون پر لمبی باتیں، طول طویل مکتوبات ---
دراصل بیلا کی بورے والا سے ایک نسبت تھی کہ اس قصبے کی نزدیک ہی پندرہ بیس کلومیٹر پہ ایک گاؤں میں اس کے قریبی اعزہ مقیم تھے- سب سے بڑھ کر اس کے والدین کی آخری آرام گاہیں بھی وہیں یعنی دیوان صاحب کے قبرستان میں ہیں- میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی فرد نہیں دیکھا جس کا دل ماں باپ کی محبت سے یوں آباد ہو- ابدال بیلا سال میں ایک دو بار لازماً بورے والا آیا کرتا- اس کی بنیادی وجہ تو

والدین کی مرقدوں پہ حاضری ہوا کرتی تھی تاہم پہلے میرے پاس شہر آتا، پھر ہم دونوں اگلی مسافت/ منزل کے لیے روانہ ہوتے۔ کئی برس یہ معمول رہا۔ اس عاجز کی طبیعت میں انٹروورژن یا کم آمیزی کا غالب عنصر عمر بھر کا روگ کہلائے گا۔ اس طرح پیٹ کے گھبرے بمشکل دو ایک احباب سے وہ قربت پیدا ہو سکی جس میں ذاتی زندگی کے قضیے موضوع گفتگو بن پائے۔ ابدال بیلا کے ساتھ راز و نیاز کا وہ رشتہ قائم ہوا؛ جس کی شاید طرفین کو توقع نہ تھی لیکن دوسروں کے بھید رکھنے میں اس شخص کو کمال حاصل تھا؛ یوں متعدد ایسے پہلو اس سے بات چیت کا حصہ بنتے رہے؛ جنھیں یہاں کوٹ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پوری پوری رات باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ بیلا کو بات کرنا آتی تھی۔ ایک Genre تشکیل دے دیتا تھا۔ اس کے ہاں داستان گوئی اسی وصف کی عطا تھی؛ لیکن اسے صرف بولنے کی للک ہرگز نہ تھی؛ سنتا بھی تھا اور پورے انہماک کے ساتھ۔ اس لیے اس کے ساتھ بیتا وقت اپنی اکائیوں کو اضافی کر دیتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس کی معیت میں اکتاہٹ کا معمولی سا سے بھی دخل اندازی کر پائے۔ حس مزاح سے بھی معمور تھا۔ بلند آہنگ قہقہہ اس کا ایک امتیاز رہا۔

پیروں فقیروں سے عقیدت بھی اس کے لہو کا مستقل جزو رہی۔ اس طرح وہ متعدد خانقاہوں پہ اکثر جایا کرتا __ اور خود بھی ہمیشہ پابند صوم و صلوٰۃ رہا __ ابدال اول و آخر ایک ادیب ہی قرار پائے گا، مذہبی رجحان رکھنے کے باوجود روایتی عالم دین نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر لکھنے کا فیصلہ کیا تو یہ طے کر کے کتاب تصنیف کی کہ تمام مندرجات ایک ادیب کے قلم کی ترجمانی کریں نہ کہ کسی Sect کے سپوکس مین ہونے کا تاثر ابھرے۔ بہر طور یہ بعد کی بات ہے؛ وہ کون سا واقعہ تھا؛ جس نے اسے اس منزہ موضوع پہ قلم اٹھانے کی تحریک دی؟ وہ اپنی جگہ حیران کن ہے! ہوا یہ کہ 1999 میں جب وہ ملتان تعینات تھا تو ایک دن اپنے عسکری کالر پہ سرخ فیتا سجائے، ہوٹر بجاتی گاڑیوں کے جلو میں فل سرکاری پروٹوکول کے ساتھ حسین آگاہی سے گزرا۔ گھر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ وہاں قرآن مجید اور سیرت کی کتابوں پہ مشتمل ایک دکان بھی ہے، جب اس کا قافلہ دھول اڑاتا ادھر سے گزرا تھا تو مٹی کے ذرات ان مقدس کتابوں پہ بھی پڑے ہوں گے! سخت مضطرب ہو کر اس نے اپنے اردلی کی بائیسکل اٹھائی اور عام لباس میں اسی دکان پہ جا پہنچا۔ جیب سے رومال نکالا اور ایک ایک کتاب کو صاف کیا۔ اس عمل پر وہاں موجود عملہ متحیر سا تھا! کتابوں کو یوں صاف کرنے کا اقدام اس کی نگاہ میں روح

کی صفائی پہ منتج ہوا۔ خود اس کے اپنے الفاظ میں: ''پھر جو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام نامی کو اس تکیلے رومال سے چمکایا تو اس نام کی چمک میں آسمان کے سب ستارے اور پورے ماہ کامل کا نور تھا۔'' اپنے من میں ٹھیرائی گئی اسی چمک کی کمک سے اس نے جو ضخیم کتاب لکھی، اسے 'آقا' سے معنون کیا۔ بیلا کی اس کاوش کو بلاشبہ اعلا تحسین ملی، جس کا وہ حق دار بھی تھا۔ یہ کام معمول سے ہٹے ہوئے جذبے کا اثبات کراتا ہے اور علمی اعتبار سے وقیع ہونے کے باعث قاری کے قلب ونظر میں خاص جگہ بناتا ہے۔

جب یعنی پرویز مشرف کے مارشل لا دور میں بیلا ملتان کا 'حاکم' تھا کہ ڈویژن کی مونیٹرنگ ٹیم کا سربراہ ہونا بہرحال ایک معنا رکھتا تھا؛ لیکن اس کے باوصف بعض اوقات عام لاری میں بیٹھ کر بھی آجاتا؛ اسے بس اسٹینڈ سے جا کر لے آتا۔ بعد میں ایک بار وہ علی الصباح آیا تو وہیں بسوں کے اڈے پر ایک حجام سے شیو بنوانے لگا۔ باربر سے کہا: پیٹ میں کچھ گرانی ہے، کہیں سے پھکی مل جائے گی؟ وہ اسے غور سے دیکھ کر بولا: آپ پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں، کسی ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے دوا کیوں نہیں لے لیتے؟ یہ ہنس پڑا:

ایم بی بی ایس ڈاکٹر میں آپ آں، تو ں ایہہ دس پھکی کتھوں ملے گی؟

عجز انکسار ایسا کہ بس کیا عرض کیا جائے! ایک مرتبہ میرا ایک عزیز فرحان ستار اور بیلا ہم تینوں کسی اور گاؤں میں ایک ساتھ گئے تو وہاں کچھ دہقان حقہ نوشی میں مصروف تھے، یہ ان کے بیچ جا کر گپ شپ لگانے لگا اور باقاعدہ شریک حقہ بھی ہوا۔ میں نے چہل کی: ایک ہی مہنال کو اتنے منھ لگتے ہیں؛ یہ ہائی جین کے خلاف ہے۔ ہنس ہنس کے دہرا ہو گیا! بیلا واقعی ایک سادہ کھرا آدمی تھا، جس میں Impostor ہونے کا شائبہ بھی تلاش نہ کر سکا۔ ایک دن میرے سٹڈی روم میں بیٹھا اپنی ترنگ میں بات کر رہا تھا کہ پیپر کٹر کی ننھی دستی بے دھیانی میں اس سے ٹوٹ گئی۔ دفعتاً اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا! گفتگو وہیں روک کر بار بار معذرت کرنے لگا! میں نے دل سے کہا بھی: یہ معمولی چیز ہے، کوئی مسئلہ نہیں! لیکن کافی دیر ڈسٹرب رہا۔ اتنی حساسیت ایک صادق شخص اور سچے تخلیق کار ہی میں ممکن ہے۔ ابھی یہ حاضر سروس ہی تھا کہ میں اپنے دوست عبدالرؤف دولہ (اب تو وہ بھی مرحوم ہو چکے) کے ہمراہ فیروز سنز پہ گیا۔ ہم نے کافی کتابیں خرید لیں، اتفاق سے ڈاکٹر بیلا بھی وہاں آ گیا۔ جب جانے لگے تو دولہ بولے: کرنل صاحب! ایک بنڈل آپ اٹھا کر گاڑی تک پہنچا دیں۔ اس پہ بیلا نے بڑی خوش دلی سے وہ کتابیں پکڑ لیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے جیسچرز اصل شخصیت کا سراغ دیتے ہیں ورنہ عسکری و غیر عسکری غرور کیسے پہلو بدل

بدل کر برآمد ہوتا ہے، توضیح کی ضرورت نہیں۔
اپنی فیملی بچوں کے ساتھ بھی راقم کے غریب خانے پہ بیلا کا آنا جانا رہا۔ اپنے منصب، تعلیم اور اتنی کتب کے مصنف ہونے پر اسے کبھی اتراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب 'دروازہ کھلتا ہے' چھپی تو اس میں پروف کی سیکڑوں اغلاط تھیں، جنھیں دن رات ایک کرکے میں نے نشان زد کیا۔ پیپر پر پراپر فہرس بنا کر بھیجی۔ شکر گزار ہوا، بعد کے ایڈیشنوں میں درستی کی۔
اگر اس کی کسی کتاب پر ریویو لکھا تو اس نے نیکسٹ اشاعت میں اسے دیباچے کے طور پر شامل کرکے عزت دی وگرنہ مجھ جیسے عام سے لکھن کا تاثر معروضی سطح پہ تو کسی اہمیت کا حامل کہاں تھا!۔! نیز اسے بھی اس کے التفات ہی سے تعبیر کیا جائے گا کہ اپنی ایک کتاب کا انتساب اس نے اس خاکسار کے نام کیا۔ وگرنہ وہی قصہ:
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

....

ولداری بیلا پہ ختم تھی! گاؤں کے نادار لوگ اس کی آمد پر جمگھٹا کر لیتے؛ مائیاں بابے نسخے لکھواتے؛ یہ اپنے بیگ میں میڈیسنز بھر کر لے آتا تھا؛ دوائیں بانٹتا جاتا اور دعائیں لیتا جاتا! کسی نے مقامی چک میڈ کوک/ پیپسی پیش کردی تو ناں نہیں کی؛ کڑ ملی چائے کی پیالی لا دی تو مسکرا کر پی لی؛ سڑک کنارے بکنے والی برفی دے دی تو وہیں آدھی پلیٹ کھا ڈالی۔ اس دوران میں مجھے دیکھ دیکھ ہنستا جاتا اور کبھی یہ نہیں کہا کہ تم بھی چکھ لو! اس لیے کہ مزاج شناسی بھی اس پہ ختم تھی۔
2009 میں میرے افسانوں کا مجموعہ 'کانچ شاخیں' چھپنے جا رہا تھا تو شفقت کی اور اس کے لیے بہت عمدہ فلیپ لکھا۔ جسے پبلشر نے بڑے اہتمام کے ساتھ پس سرورق بنوایا۔ کے پی کے سے ایک خاتون نے اپنے ایم فل کے مقالے کی مناسبت سے بذریعہ ڈاک رابطہ کیا تو میں نے یہ کتاب انھیں بھیج دی۔ چند دنوں بعد ان کی طرف سے خط آیا، جس میں کہا گیا تھا کہ بیک ٹائٹل پیج پر تحریر کے اوپر تصویر اگر ڈاکٹر ابدال بیلا کی ہے تو ان کا فون نمبر بھیج دو، اگر مصنف کتاب کی ہے تو اپنا نمبر بھیج دو! یہ لطیفہ جب بیلا کو سنایا تو بہت محظوظ ہوا!
یہ مبالغہ نہیں امر واقع کا اظہار ہے کہ ادیب/ شاعر/ فنکار ہونے کے ناتے بیلا میں جمالیاتی ذوق بے پناہ تھا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف ایک آدھ بے ضرر سا واقعہ ___ پانچ سات برس پیشتر بیلا کے جی میں جانے کیا آئی کہ اس نے 'ممتاز مفتی میڈل' کے اجرا کا اعلان کر دیا۔ جب میڈل یافتگان کے نام سامنے آئے تو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ خوش نصیبوں میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی اور سب تک سک سے خوب درست تھیں ___ میں نے فون کرکے حسب عادت تحول کیا: ادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کے ہاں تخصی دلآویزی کی اہمیت سر فہرست رہی ___

کوئی اور ہوتا تو شاید ردعمل ظاہر کرتا مگر بیلا تو بیلا تھا___ زندہ دل حبیب! مسلسل ہنستا رہا! بیلا واقعی رعنائی کی جانب بے اختیار کھنچتا چلا جاتا تھا۔ اس کی ایسی ہی بے خودی پر ایک ذہین و حسین خاتون نے بہت مزے کا تبصرہ کیا تھا: 'بیلا کو وہیں اپنی گاڑی پارک کرنے کا شوق ہے، جہاں نو پارکنگ کا بورڈ لگا ہوتا ہے۔'

ابدال بیلا نے ایک فن کار کی حساسیت سے بھی وافر حصہ پایا تھا۔ ایک روز بتانے لگا: اسلام آباد میں اپنے زیر تعمیر مکان کو دیکھنے گیا تو مستری مزدور دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ لیبر سے یونہی دوستانہ لہجے میں کہا، کیوں بھئی بڑی موجیں ہو رہی ہیں! تو اس پر ایک مزدور بولا: صاحب! ہم تو یہاں اسی وقت تک ہیں، جب تک یہ مکان بن رہا ہے، بعد میں تو ہمیں کسی نے گیٹ کے اندر بھی نہیں آنے دینا! یہ بتاتے ہوئے بیلا کی آنکھیں بھیگ گئیں!

بیلا یار! اب دنیا سے چلے جانے پر تمھیں کتنے پیار کرنے والوں کی آنکھیں اشکوں سے بھیگ رہی ہیں، کیا ان کا یہ دکھ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں وا نہیں کرو گے!؟!

حواشی

جب بیلا کے ساتھ پہلی مرتبہ دیوان صاحب جانے کا اتفاق ہوا تو واپس آ کر اخبار کے لیے اپنے تاثرات قلمبند کیے تھے۔ اس تحریر سے ایک اقتباس: ''کرنل بیلا نے اس جگہ کی بابت بتایا کہ ایک خاص نسبت کے سبب اس کی نظر میں یہ مقام اور بھی متبرک رہے گا کہ اس کی امی جان، والد صاحب اور ہمشیر اسی مٹی میں دفن ہیں۔ قبرستان میں ہم مطلوبہ مقابر تلاش کرتے ہوئے جا رہے تھے تو کرنل ایک دم رک گیا! دو قبروں کے قدموں میں: 'جنت نشاں' اور 'خلد آشیاں' کے الفاظ پر مشتمل چھوٹی چھوٹی تختیاں نصب تھیں___ کرنل نے فوجی طریقے سے سلیوٹ کیا___ جانے کتنی دیر وہ دعائیں پڑھنے میں محو رہا___ پھر وفعتاً اس کے چہرے میں ایک تغیر برپا ہوا، جیسے بقول شخصے انڈے کو ٹھیس پہنچے تو وہ جگہ جگہ سے پچک جاتا ہے۔ اس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ اس کے بدن میں تریڑیں پڑ گئیں اور اس کا پورا وجود ہولے ہولے کانپنے لگا۔ وہ جھکا اور دیوانہ وار قبروں کو چومنے لگا۔ ہم حیران تھے کہ اس بیٹے کے دل میں اپنے ماں باپ کے لیے کتنی عقیدت موجزن ہے! ہم ان دو افراد کے ساتھ ایک فرد کے اظہار محبت کا مشاہدہ کر رہے تھے جو سالہا سال قبل اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ ہمیں یہ نتیجہ حیرت زا خوشگواریاں بخش رہا تھا کہ ایک استحکام یافتہ ذات ہی اس طرز احساس کی مالک ہو سکتی ہے؛ جو گزرے ہوئے لوگوں سے رشتوں کو یوں نباہ سکتا ہے؛ وہ زندوں کے لیے بھی رحیم اور شفیق ہی ہوگا۔

☆☆☆☆☆

محترمہ عذرا نقوی __ دُخترِ اُردو اور ادب کی خوشبو

دخترِ اردو محترمہ عذرا نقوی کی کثیر الوصف شخصیت اور فکر و فن کے کیا کہنے- ان کے تخلیقی، تصنیفی، صحافتی اور ادبی رنگ دیکھ کر زمانہ دنگ ہے- یہ ایک صاحبِ طرز شاعرہ، آواز کی دنیا کی ملکہ، منجھی ہوئی ادیبہ، کانوں میں رس گھولنے والی صداکارہ، دل کے تار ہلا دینے والی کہانی کار، روشن خیال میڈیا ویمن، فری لانس جرنلسٹ، اردو اور انگریزی زبانوں کے اخبارات و جرائد کو اپنی نگارشات سے نوازنے والی تخلیق کار گیانی، درس و تدریس کی ماہرہ، مایہ ناز مصنفہ، ممتاز مترجم، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پروردہ، خوب صورت شخصیت کی مالکہ اور خوش آواز اناؤنسر کی حیثیت سے دیس دیس میں نام، مقام اور احترام کمانے کے بعد اب بائیس ولیوں کی چوکھٹ دلی سے اپنا رشتہ بحال کر چکی ہیں- یہ وہی شہر ہے جو عالم میں انتخاب اور تہذیبی وراثت کا امین ہونے کے باعث لاجواب ہے- میرے اندر کا ظفر معین بلے جعفری مجھے بار بار کہہ رہا ہے کہ کچھ شعری زبان میں بھی بات کرو- اس سخن فہم، سخن شناس اور سخن نواز شخصیت کے چاہنے والوں کو بھی اچھا لگے گا- چنانچہ اسی فرمائش پر میں ایک نظم دخترِ اردو کے نام کر رہا ہوں- جس کا عنوان ہے- دخترِ اردو ہیں اپنی ذات میں اِک انجمن- اس نظم میں آپ کو محترمہ عذرا نقوی کی ادبی خدمات کی کچھ جھلکیاں بھی نظر آئیں گی- اب آپ نظم ملاحظہ فرمایئے-

ظفر معین بلے جعفری

دخترِ اردو......

حکمت و دانش کی دُنیا ، ملکۂ اقلیمِ فن
دخترِ اردو ہیں اپنی ذات میں اِک انجمن
شاعرہ بھی ہیں، ادیبہ بھی ،صدا کارہ بھی ہیں
ہے جداگانہ یقیناً اِن کا ہر رنگِ سخن
ترجمے کر کے بھی دُنیا میں مچا رکھی ہے دُھوم
بخشا انگریزی ادب پاروں کو اردو پیرہن
ہے نفاست نام گُل افشانیٔ گفتار کا
سُن کے باتیں آپ کی، جی اُٹھتے ہیں اربابِ فن
امروہہ کی شان تھیں، یہ اب ہیں دلّی کی بھی جان
ریختہ کی آبرو ، ہے آپ پہ نازاں وطن
ملکوں ملکوں آپ نے جا کر کمایا ہے مقام
ہے ادب میراث ان کی، پارسائی ان کا دھن
جادۂ فکر و نظر پر چھوڑے ہیں اَن مٹ نقوش
رنگ لے آئی ادب سے عذرا نقوی کی لگن
(ظفر معین بلے جعفری)

....

محترمہ عذرا نقوی کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے الفاظ سے کھیلنا خوب آتا ہے۔ یہ دخترِ اردو ہیں اور انھوں نے اپنی ماں بولی کی تخلیقی توانائیوں کو سامنے لانے اور پروان چڑھانے کے لیے جو کوششیں شبانہ روز کی ہیں، وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ الفاظ اور آواز میں جو طاقت ہے، وہ کسی اور شے یا ہنر میں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ دونوں دنیاؤں میں اپنی آواز اور الفاظ کی بنیاد پر کئی دہائیوں سے چھائی ہوئی ہیں۔ جہاں جہاں ریختہ بولی ، پڑھی ، سنی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں وہاں محترمہ عذرا نقوی کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ یہ چند سطور لکھنے کے بعد میرے اندر کا شاعر اپنے جذبوں کو شعروں کی زبان دینے کے لیے ایک بار پھر مجھے اُکسا رہا ہے۔ لہٰذا پہلے میرے اندر کے ظفر معین بلے کی آواز سن لیں۔ پھر باقی باتیں اس نظم دخترِ اردو کے بعد ہوں گی۔

ایک نظم۔ادب کی آبرو ....

دخترِ اردو ہیں یہ بے شک ، ادب کی آبرو
روشنی پھیلا رہی ہیں ریختہ کی چار سو
اِک زمانہ معترف ہے آپ کی خدمات کا
عذرا نقوی سرخرو ہیں ، ریختہ بھی سرخ رو
قابلِ تحسین ہیں سب کارنامے آپ کے
دیدنی ہے آپ کا یہ نظم و ضبطِ رنگ و بو
ریختہ کے داماں کو بخشی ہے وسعت آپ نے
چرچا ہے اس بات کا گلشن بہ گلشن، کو بہ کو
آپ کے اوصاف کو کیا نام دوں کہ آپ ہیں
نیک فطرت، نیک سیرت، نیک عادت، نیک خو
اِک لڑی میں سارے موتی ہی پرو کے رکھ دیے
ہے یہ مالا کارنامہ ، ریختہ -- گویا گلو
ہوں بہت سے پہلو جس کی شخصیت کے اے ظفر
سوچ لو کیا ہو سکے گی ،تم سے اُن پر گفتگو
(ظفر معین بلے جعفری)

....

محترمہ عذرا نقوی کی بہت سی غزلیں، نظمیں اور دیگر تخلیقی نگارشات میرے سامنے ہیں۔

قدیم اور جدید رجحانات کے امتزاج نے ان کے شعری لب و لہجے کو بلاشبہ ایک ایسی دل کشی بخشی ہے جو قارئین کے دامن دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ترجمہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنے جوہر خوب دکھائے ہیں۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران سعودی ادب کے انگریزی تراجم نے انھیں متاثر کیا اور انھوں نے ان تمام موتیوں کو چُن چُن کر دامنِ اردو میں سمیٹ لیا ہے۔ اجنبی زبان کے ادب کو اپنی مادری زبان کے قالب میں ڈھالنا آسان نہیں بل کہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ترجمہ نگار کو دونوں زبانوں پر غیر معمولی قدرت حاصل ہو۔ دُخترِ اردو نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایسا ہی ہے۔ انھیں دونوں زبانوں پر جو دسترس حاصل ہے، اس کی گواہی ان کی کاوشوں سے بھی ملتی ہے۔ سعودی عرب کی قلم کار خواتین کی منتخب کہانیاں ''وائسز آف چینج'' کو انگریزی سے اردو زبان میں بڑی استادانہ چابک دستی کے ساتھ ڈھال دیا۔ میرے شب و روز کے عنوان کے تحت مشہور و معروف سعودی صحافی احمد السباعی کی سوانح حیات ''مائی ڈیز ان مکہ'' کے انگریزی ترجمے کا اردو میں ترجمہ بھی ایک خاصے کی چیز ہے، جس پر انھیں اہلِ علم و ادب نے جی کھول کر داد دی۔ یہی نہیں بہت سے ناولوں، سوانح عمریوں، خود نوشتوں، کہانیوں اور افسانوں کے اقتباسات کو بھی دخترِ اردو نے اپنی زبان کے قالب میں ڈھالا اور اردو ادب کے قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کا اہتمام کیا۔ یہ خوب صورت تراجم بہت سے اخبارات و جرائد کی زینت بنے اور یوں محترمہ عذرا نقوی کی شہرت اور مقبولیت کا دائرہ خوشبو کی طرح بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ وہ دیس دیس میں رہیں اور جہاں جہاں رہیں، ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور تخلیق کاروں کا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ انھیں ''ڈو۔ مور'' کے لیے اُکساتی رہیں۔ کاروانِ ادب کے ذوق و زوق کو جگاتی رہیں۔ علم و عرفان کے دیپ جلاتی رہیں۔ تشنگانِ ادب کی پیاس بجھاتی رہیں اور افکار و خیالات کی روشنی پھیلا کر راستوں کو جگمگاتی رہیں۔ دخترِ اردو نے انگریزی زبان سے اردو زبان میں محض تراجم نہیں کیے بل کہ لکھاریوں کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اور نگارشات کے معنوی حُسن و رعنائی کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی اور فکری توانائیوں کو بروئے کار لا کر ان میں نیا رنگ بھی بھر دیا ہے۔ ہر چند کہ اس حوالے سے ان کا بہت سا کام ابھی سامنے نہیں آیا، لیکن جو کچھ بھی سامنے آیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ اگر مجھے دُخترِ اردو اور ریختہ کی آبرو محترمہ عذرا نقوی

اجازت دیں تو میں ان سے یہ فرمائش ضرور کروں گا کہ وہ اپنے اس وقیع کام کو بند صندوقوں سے نکال کر ترجیحی بنیادوں پر سامنے لائیں تاکہ قارئین اردو ادب بھی ان سے مستفیض ہو سکیں۔

عذرا نقوی کے والد حسین احمد قیصر نقوی ایک سوشل مشہور سوشل ورکر تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سوشل ایجوکیشن آفیسر تھے۔ اس سے پہلے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے منسلک تھے۔ ان کی والدہ سیدہ فرحت شاعرہ تھیں۔ وہ ڈاکٹر عابد حسین کی بھانجی تھیں اور ان ہی کے زیرِ تربیت رہی تھیں۔

عذرا نے ایم ایس سی تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔

اسی نامور یونیورسٹی کی فضاؤں میں آنکھ کھولی، یہیں پلی بڑھی، پڑھی اور پروان چڑھیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں مسلم یونیورسٹی نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا ہے اور ان کا ہر رنگ، ڈھنگ اور آہنگ مجھے اس کی گواہی دیتا محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ دخترِ اردو نے تعلیم تو سائنسی مضامین کے ساتھ حاصل کی ہے اور ایم۔ ایس سی۔ اے۔ ایم یو۔ علی گڑھ سے کیا ہے لیکن اپنے رنگ دنیائے ادب میں بھی جمائے اور دکھائے ہیں۔ انھوں نے ایم فل۔ جے این یو۔ دہلی سے اور ڈپلوما ان ایجوکیشن۔ کینیڈا سے کیا۔ کتب بینی ان کا شوق اور فکر و خیال کو الفاظ کا ملبوس عطا کرنا ان کا ذوق ہے۔ ڈگریاں اور اعزازات سمیٹنے کے باوجود ان کا سفر تھما نہیں بل کہ جوش و خروش کے ساتھ جاری ہے۔

ادب اور تعلیم کے بہت سے شعبوں میں انھوں نے اپنے شاگردوں کو علم و عرفان کی دولت سے مالا مال کیا اور نسلِ نو میں آتشِ شوق کو بہ اندازِ دگر بھڑکا کر کمال کیا ہے۔

ہوا کے دوش پر ان کی آواز دیس دیس میں پہنچی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں اناؤنسر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی صداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ کینیڈا میں بھی کمیونٹی ریڈیو سے وابستگی نے انھیں مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچایا۔ اب وہ آسمانِ شہرت پر ایک درخشندہ ستارے کی طرح جھلملا رہی ہیں۔ ان کے انداز، بلندی پر پرواز اور تیور بتا رہے ہیں کہ وہ جس آسمان کو چھو لیں، اسے زمین بنا کر نئے آسمان کی تلاش شروع کر دیتی ہیں۔ ان کا تخلیقی، تصنیفی، تحقیقی اور جمالیاتی سفر جاری ہے اور جو نقوش انھوں نے جادۂ ادب پر مرتسم کیے ہیں، وہ ان کی کامیابیوں کی گواہی دیتے نظر آ رہے ہیں۔ ان کی شہرت کی خوشبو صرف بھارت، پاکستان، کینیڈا اور سعودی عرب تک محدود نہیں، جہاں جہاں اردو ہے، وہاں وہاں اس دخترِ اردو کی مہک اور اس کثیر الجہت شخصیت کے دلکش رنگ دیکھے

جاسکتے ہیں- اب پھر میرے اندر کا شاعران کی شخصیت، فن، اور خدمات کو تحسین و آفرین کے گلاب پیش کرنے کے لیے مجھے شعری زبان میں اس مضمون کو جاری رکھنے پر اکسا رہا ہے لہٰذا جو اشعار فی البدیہہ زبان قلم پر آگئے ہیں،

محترمہ عذرا نقوی جون ایلیا کے شہر امروہہ کی بیٹی ہیں اور کینیڈا، سعودی عرب کے ساتھ ساتھ مشرقِ وسطیٰ کے کئی ملکوں میں برسوں علم و عرفان کے چراغ روشن کرنے کے بعد اب بھارتی دارالحکومت دلی میں آن بسی ہیں - دلی بائیس خواجگان کی چوکھٹ اور ادب و تہذیب کا گہوارہ ہے- بڑی بڑی ہستیوں نے اس کی آن بان اور شان بڑھائی اور زندگی کے بہت سے شعبوں میں اپنی خدمات کی بنیاد پر اسے نئی پہچان بھی عطا کی ہے- امروہہ بھارت کی شمالی ریاست اتر پردیش کا مردم خیز شہر اور نامور ہستیوں کا مسکن رہا ہے اور آج بھی ہے- دلی اور امروہہ ایک دوسرے سے 130 کلومیٹر کی دوری پر ہیں لیکن ان دونوں شہروں کے باسیوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں - عذرا نقوی کو اپنے آبائی شہر امروہہ سے بڑا پیار ہے- ان کے شعروں میں بھی امروہہ کی مہک محسوس ہوتی ہے- انہیں جون ایلیا کی شاعری بھی بے حد پسند ہے- اسی لیے انھوں نے جون ایلیا کی نذر اپنی ایک غزل کی ہے اور اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ جون ایلیا کی نذر کی جانے والی اس غزلِ مسلسل میں انھیں اپنے وطن عزیز امروہہ کی جھلک نظر آتی ہے -

آپ یہ غزل پڑھئے اور سر دھنئے- محترمہ عذرا نقوی کے لب و لہجے میں امروہہ جذبوں کی طرح دھڑکتا محسوس ہو رہا ہے- یہ شہر انھیں اپنے سانسوں میں بسا ہوا بھی دکھائی دے رہا ہے اور اجنبی اجنبی بھی- اس لیے کہ جس شہر میں ان کا اپنا آشیاں تھا، وہاں ڈھونڈے سے بھی اب کوئی انھیں اپنا آشنا نظر نہیں آ رہا- محراب و در تو شکستہ ہو چکے ہیں لیکن ابھی محترمہ عذرا نقوی کے ذہن سے اس شہر کا نقشہ محو نہیں ہوا- ان کی بے قراری اسی لیے بڑھتی جا رہی ہے کہ جو دور وہ اس شہر کے گلی کوچوں میں چھوڑ کر گئی تھیں، وہ انھیں کہیں دکھائی نہیں دے رہا- اسی لیے وہ سفاک ہجرت سے واپسی پر خود کو یاد دلانے پر مجبور ہیں کہ کبھی گزرا زمانہ لوٹتا نہیں ہے- اب آپ ان کی یہ غزل دیکھئے- آپ کو شاعرہ کے زخموں کے لب کھلتے محسوس ہوں گے-

نظم جون ایلیا کی نذر، ایک مسلسل غزل جو اُن کے اور میرے وطن امروہہ کے لہجے کی جھلک دکھاتی ہے

یہ دل بس میں کبھی میرے رہا تھا

پہلے آپ انھیں سماعت فرمالیں، پھر باقی کچھ باتیں نثری پیرائے میں ہوں گی:

آنگن جب پردیس ہوا تو دل کے موسم بدلے ہیں
بدل گئی ہے دنیا لیکن آپ بہت کم بدلے ہیں

دیس دیس میں پہنچی ہوا کے دوش پہ یہ دلکش آواز
لکھیں کتابیں، شعر کہے ہیں، شوق کے عالم بدلے ہیں

نام کمایا ہے درس و تدریس میں عذرا نقوی نے
یوں بھی کھلا کر پھول ادب آنگن کے موسم بدلے ہیں

شعر، کتابیں یادیں سرمایہ ہیں دُختر اردو کا
کوئی نہیں کہہ سکتا ادب کے رنگ بہت کم بدلے ہیں

خوب تراجم کو بھی سجایا ہے تخلیقی رنگوں سے
خوب نظامت فرمائی، انداز بھی پیہم بدلے ہیں

آپ ادب کی آبرو بھی ہیں، ریختہ کی پرچارک بھی
جہاں جہاں بھی آپ گئیں، اُس دیس کے موسم بدلے ہیں

سوچ رہا ہوں ظفر بتاؤ، اُسے سلامی کیسے دوں
علم و ادب کے منظر نامے، جس نے ہر دم بدلے ہیں
(ظفر معین بلے جعفری)

دختر اردو محترمہ عذرا نقوی نے کہاں کہاں دولتِ علم و حکمت سمیٹی۔ کون کون سی کتابیں لکھیں؟ ادب، فن اور درس و تدریس کی دنیا میں کون کون سے نقوش چھوڑے؟ ان کا اختصار کے ساتھ ذکر کیے بغیر یہ مضمون یقیناً ادھورا ہی رہے گا۔ اس لیے ان کے بارے میں جو اہم باتیں اس حوالے سے میں نے سنی یا گلشن ادب سے پھولوں کی طرح چنی ہیں، انھیں ایک گلدستے کی شکل دے کر آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ آپ بھی ان سے اپنے مشامِ دل و جاں کو معطر کر سکیں گے۔

اب دُختر اردو اور ادب کی خوشبو محترمہ عذرا نقوی صاحبہ کے سوانحی خاکے کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

ادبی نام: عذرا نقوی۔
مکمل نام: عذرا قیصر نقوی
پیدائش۔ 22۔ فروری۔ 1952، دہلی
آبائی وطن: آمروہہ۔
والد کا نام: حسین احمد قیصر نقوی

....

محترمہ عذرا نقوی کے والد گرامی حسین احمد قیصر نقوی صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی AMU میں سوشل ایجوکیشن آفیسر تھے۔
1957 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے علی گڑھ آئے تھے۔
اس کے بعد وہیں رہے۔

تعلیم اور تعلیمی ادارے

تعلیم: ایم۔ایس سی۔اے۔ایم یو۔ علی گڑھ
ایم فل۔ جے این یو۔ دہلی
ڈپلوما ان ایجوکیشن۔ کینیڈا

مطبوعات:-

شعری مجموعہ - دل کے موسم

افسانوی مجموعہ

آنگن جب پردیس ہوا

اخباری کالم - اور مضامین کا مجموعہ

''جہاں بنالیں اپنا نشیمن''

مضامین اور انشائیوں کا مجموعہ

''شعر - کتابیں - یادیں''

''میرے وطن کی خوشبو - '' (حب الوطنی پر مبنی شاعرات کا منتخب کلام)

- اردو شبدوں کا گلدستہ - (دیوناگری رسم الخط میں)

ایک شاعری کا شبد سنسار (دیوناگری رسم الخط میں)

تراجم (انگریزی سے اردو)

محترمہ عذرا نقوی کی ترجمہ نگاری کے حوالے سے خدمات

voices of change

میں شامل سعودی خواتین کی لکھی ہوئی کہانیاں انگلش سے اردو میں ترجمہ کیں

میرے شب و روز-

احمد السباعی کی خودنوشت کے انگریزی ترجمے

My days in Mekkah

سے اردو میں ترجمہ کی-

اس کے علاوہ

سعودی عرب کے ادب کی ضخیم antholoy کے انگریزی ترجمے "

Beyond the Dunes

سے متعدد ناولوں کے اقتباس - سوانحی تحریریں اور کہانیاں اردو میں ترجمہ کیں جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئیں

''سعودی عرب کی قلمکار خواتین کی منتخب کہانیاں''

'' میرے شب و روز'' مشہور سعودی صحافی احمد السباعی کی سوانح

(ترتیب و تدوین:)

محترمہ عذرا نقوی صاحبہ نے قادرالکلام شاعرہ محترمہ سیدہ فرحت صاحبہ کی کلیات مرتب کر کے اپنی والدہ ماجدہ سیدہ فرحت صاحبہ کا خوب صورت اور جاندار و شاندار کلام کو'' کلیات سیدہ فرحت'' کے نام سے یکجا کیا-

والدہ سیدہ فرحت کی کلیات مرتب کر کے محترمہ عذرا نقوی صاحبہ نے اپنی والدہ ماجدہ کی اس طور بھی خدمت کا فرض ادا کیا- اور ایک اہم ادبی قرض بھی چکتا کیا-

شادی کے بعد اپنے شوہر (مرحوم) ڈاکٹر پرویز احمد کے ساتھ 38 برس کینیڈا اور مشرق وسطیٰ میں گذار کر واپس ہندوستان آگئے ہیں- پچھلے دس سال سے گریٹر نوئیڈا (نزد دہلی) میں قیام پذیر ہیں-

اردو کی مشہور ویب سائٹ ریختہ'' _ سے منسلک ہیں- اور اہم ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں

آواز کی دنیا کی عذرا نقوی

ہندوستان ، کینیڈا اور سعودی عرب میں مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس سے وابستہ رہی ہیں-

آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں اناؤنسر

رہی ہیں۔ کینیڈا میں بھی کمیونٹی ریڈیو سے منسلک رہی ہیں۔

مانٹریال کے قیام کے دوران ساؤتھ ایشیا کمیونٹی سینٹر برائے خواتین اور ''تیسری دنیا'' نامی تھیٹر گروپ کے قیام میں فعال کردار ادا کیا۔

جدہ سے شائع ہونے والے اردو روزنامے ''اردو نیوز'' اور انگریزی روزنامے ''سعودی گزٹ'' میں آزاد (فری لانس جرنلسٹ) صحافی کے طور پر شاندار خدمات انجام دیں:

سعودی عرب کی تنظیم ''ہم ہندوستانی'' کی جانب سے ''دخترِ اردو'' کے خطاب و اعزاز سے نوازی گئی ہیں۔

اب دخترِ اردو، ریختہ کی آبرو محترمہ عذرا نقوی کے خوب صورت کلام کی کچھ جھلکیاں آپ کو دکھانا ضرور چاہوں گا تاکہ آپ دیکھیں تو آپ کا دل گواہی دے کہ میں ان کی شخصیت کے رنگوں اور ان کیفن کی رعنائیوں کو پینٹ کر پایا ہوں نہ ہی یہ اور ان کا کلام دونوں جس تحسین و آفرین کے لائق ہیں، میں اپنی کم علمی کے باعث ان سے انصاف کر سکا ہوں۔ انتخابِ کلام

داستانِ زندگی لکھتے مگر رہنے دیا
اس کے ہر کردار کو بس معتبر رہنے دیا

کوئی منزل کوئی مفروضہ نہ تھا پیشِ نظر
زیرِ پا اک رہگزر تھی رہ گزر رہنے دیا

دل کے ہر موسم نے بخشی دولتِ احساس و درد
صرف اس سرمائے کو زادِ سفر رہنے دیا

ساتھ اک خوش باش لہجہ محفلوں میں لے کے آئے
دل کی ویرانی کو تنہا اپنے گھر رہنے دیا

شور کرتی بھاگتی دنیا میں شامل بھی رہے
ایک سر مدھم سا دل کے ساز پر رہنے دیا

وقت کے بہتے ہوئے دریا پہ کشتی ڈال کر
سارے اندیشوں سے خود کو بے خبر رہنے دیا

خود غرض تھوڑا سا ہونا بھی ضروری تھا مگر
تجربوں سے سیکھ کر بھی یہ ہنر رہنے دیا

ساری دنیا کے لئے ہر شب دعائے خیر کی
ذکر اپنی خواہشوں کا مختصر رہنے دیا

کیوں کوئی دیکھے ہمارے دل کی ساری مملکت
اک جھلک دکھلائی ہے اور بیشتر رہنے دیا

کون دامن گیر ہے اکثر یہ کرتا ہے سوال
کر تو سکتیں تھیں بہت کچھ تم مگر رہنے دیا

....

وہی بے چہرہ لوگوں سے بھرے بازار لگتے ہیں
یہ جگ مگ شہر بھی اکثر ہمیں بیمار لگتے ہیں

کبھی خوابوں کے نقشوں پر محل تعمیر کرتے ہیں
کبھی اپنے ارادے ریت کی دیوار لگتے ہیں

اداکاری سی لگتی ہے یہ ساری اپنی
کسی تمثیل میں دیکھا ہوا کردار لگتے ہیں

نہ ان سے جیت سکتے ہیں نہ خود سے ہار مانی ہے
ہم اپنے آپ سے ہی برسرِ پیکار لگتے ہیں

فقط شہرت کی خاطر نظم لکھیں شعر چھپوائیں
یہ سارے سلسلے سچ پوچھیے بیکار لگتے ہیں

وضعداری کی خوشبو ہے ابھی تک اس کے لہجے میں کال
کسی گذری ہوئی تہذیب کے آثار لگتے ہی

....

آدھی جاگی آدھی سوئی رات بھی تھی کہنائی سی
آنکھ کھلی تو در پہ کھڑی تھی صبح بھی کچھ کھلائی سی

دن بھر پیٹھ پہ ڈھویا سورج چہرے پر تھی گرد جمی
ساتھ میں دفتر سے گھر لوٹی شام بھی کچھ اکتائی سی

اندیشوں کی انگلی تھامے سال گذرتے رہتے ہیں
کبھی کبھی لگنے لگتی ہے اپنی عمر پرائی سی

شاہ بلوط چنار صنوبر انسانوں کی نذر ہوئے
گود میں پربت کے لگتی ہیں جھیلیں بھی گھبرائی سی

لوٹ کے جانا ناممکن ہے آگے منظر دھندلے ہیں
بڑھتے قدموں میں حائل ہے خوف کی گہری کھائی سی

سوکھے سوکھے جمنا تٹ پر پیلا ہوتا تاج محل
صبح بنارس دھندلی دھندلی گنگا جی گدلائی سی

نظمیں:

نجد کی ایک رات

رات تاریک تھی اک کالے سمندر کی طرح
اجنبی دیس تھا تنہائی تھا
جگمگاتے ہوئے بازاروں کی بے کیف فضا
اور بوجھل سا کیے دیتی تھی جسم وجاں کو
شہر کی حد سے پرے
دور تک پھیلے ہوئے ریت کی سفاکی تھی
آسماں دھول میں لپٹا ہوا تا حدِ نظر
کوئی سایہ نہ سراب
کار میں بجتا ہوا گیت بھی الفاظ کی تکرار تھا
بے روح تھی لے
پھر اچانک مجھے مانوس سے اک لمس نے بیدار کیا
تھپکیاں دے کے مرے شانے پر
پیار سے سرگوشی کی
میں ترے ساتھ یہاں تک آیا
میں ابھی چوم کے آیا ہوں تری خاکِ وطن
تیری گلیاں، ترے مانوس در و بام، تیرا گھر آنگن
تیرے ماں باپ کے آزردہ سے مشفق چہرے
منتظر آنکھوں کی خاموشی کو چوم آیا ہوں
تیرے آنگن کی چمبیلی کی دعا لایا ہوں
یاد ہے -- یاد ہے ----

کوئی کہتا ہی رہا
وہ ستمبر کی خنک رات تھی، میں تھا، تم تھیں
ریڈیو پر کوئی بجتی ہوئی اسپینش دھن
دور میپل کے گھنے جنگل میں
ہم کو مدہوش کیے دیتی تھی

یاد ہے
تجھ کو لڑکپن میں کبھی
آم کے بور کی بیلے کی چنبیلی کی مہک ساتھ لیے
کچے آنگن پہ جھکے نیم کی شاخوں میں ہوا
بہتی تھی
اور ہم دونوں بہت دیر تلک جاگتے تھے
راز کی باتیں کیا کرتے تھے
کوئی کہتا ہی رہا.... یاد کرو ... یاد کرو
دیپ سے دیپ جلے یادوں کے
اور کچھ ایسا ہوا
یک بہ یک چلنے لگی بادِ صبا نجد کے صحراؤں میں
اور اک نور کا دریا سا نظر آنے لگا صحرا میں
کار کے بند دریچے سے اتر آیا مری گود میں چاند

نظم

انھیں مجھ سے شکایت ہے کہ میں ماضی میں جیتی ہوں
مرے اشعار میں آسیب ہیں گزرے زمانوں کے
وہ کہتے ہیں کہ یادیں سائے کے مانند
میرے ساتھ رہتی ہیں
یہ سچ ہے اس سے کب انکار ہے مجھ کو
میں اکثر جاگتے دن میں بھی آنکھیں موند لیتی ہوں
کوئی صورت - کوئی خوشبو - کوئی آواز - کوئی
ذائقہ یا لمس جب جادو جگاتا ہے
تو ''منیاتور'' تصویریں اچانک بولنے لگتی ہیں
ناٹک منچ سجتا ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کسی ٹوٹے ہوئے صندوق میں رکھے
ہوئے بوسیدہ مخطوطے سے کوئی داستاں
تمثیل بن جاتی ہے
جی اٹھتے ہیں سب کردار ماضی کے
سپاہی - بادشاہ - خلعت
نوادر - رقص و موسیقی
کسی کے پاؤں میں پائل - دھنک آنچل -
کسی بارہ دری میں راگ دیپک کا
کدم کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی چڑیاں اچانک
جاگ جاتی ہیں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے -
کسی گمنام قصبے میں کوئی ٹوٹی ہوئی محراب -
خستہ حال ڈیوڑھی کی جھلک
معدوم کر دیتی ہے
ہوٹل - چائے خانے - بس کے اڈے - ڈھیر
کوڑے کے
کئی صدیاں گذر جاتی ہیں سر سے
کوئی گم گشتہ شہرِ رفتگاں بیدار ہوتا ہے
اسی منظر کا حصہ بن کے میں تصویر ہو جاتی
ہوں کھو جاتی ہوں ماضی میں
میں اکثر آبنائے وقت پر کاغذ کی ناؤ ڈال دیتی ہوں
تو پانی اپنا رستہ موڑ دیتا ہے
میں جب چاہوں سلونی - سانولی نٹ
کھٹ مدھر یادیں اُٹھا لاؤں لڑکپن کے

گھروندوں سے
میں جب چاہوں
تو کالی کوٹھری میں قید رنجیدہ، پشیماں، زخم
خوردہ ساعتوں بیتے دنوں کو پیار سے چھو کر
دلاسہ دوں تھپک کر لوریاں دوں،
خوب روؤں، خوب روؤں، شانت ہو جاؤں
یہ ماضی میرا ماضی ہے فقط میرے تصرف
میں ہے۔ میرا ورثہ ہے
نہ میرا حال پر بس ہے
اور آنے والا کل بھی کس نے دیکھا ہے

نظم .... شہر جاں کے موسم
مرے دل کے سارے موسم
مرے شہر جاں کے موسم
ترے نام کر دیئے ہیں
کوئی آتشیں بگولہ
کوئی مدھ بھری پون ہے
کوئی چاند کا ہنڈولہ
کوئی بے خودی کا آنچل
کبھی آنسوؤں کی برکھا
کبھی تیز و تند آندھی
کبھی زرد دوپہر سا وہ سکوتِ دل کہ جس میں
نہ خوشی نہ کوئی غم ہو
کبھی خواب سے مناظر جو ہوا میں تیرتے ہوں
کبھی راگنی سی شامیں
کبھی گنگناتی صبحیں
کبھی درد کے سمندر سی اتھاہ کالی راتیں
یہ بدلتے دل کے موسم
ترے نام کر دیئے ہیں
کوئی بدگمان بادل
کوئی بے رخی کا موسم
کبھی آ کے ٹھہر جائے
مرا اعتبار کرنا
مجھے پھر بھی پیار کرنا

ہار سنگھار
تم نے دیکھے ہیں کبھی ہار سنگھار
وہ دل آویز سے معصوم سے دور نگے پھول
رات کو شاخ پہ کھلتے تھے ستاروں کی طرح
وہ بھلا دن کی تمازت کے ستم کیوں سہتے
اس لئے آخرِ شب اپنے ہی حسن سے
بے خود ہو کر
اوس سے بھیگے ہوئے فرش پہ کس پیار سے
بچھ جاتے تھے
جیسے کل رات یہاں
زعفران رنگ کی چادر پہ بکھیرے ہوں کسی نے موتی
اور ہر روز سویرے کوئی بچی آ کر
فرشِ گل پر بہت آہستہ سے چلتی تھی
خیالوں میں پہنچ جاتی تھی
اس پرستان میں کہ جس کی پریاں
رات کو فرش پہ یہ پھول بچھا جاتی تھیں
یاد گلیوں سے گزرتی ہوں تو بچپن کے کسی
موڑ پہ مل جاتے ہیں
وہی معصوم، دل آویز، سبک ہار سنگھار
جانتی ہوں میں وہاں
اب مرے صحن کی دیوار کے اس پار نہیں کوئی درخت
اب وہاں ایک عمارت ہے بہت اونچی سی

☆☆☆☆☆

''اکمل حنیف کا تخلیقی'' ردِ عمل

اسلام علیکم!   محترم عمران منظور بھائی

امید کہ آپ مع اہلیان بیاض بہ خیر و عافیت ہوں گے۔ ادھر ہمارے ہاں کینیڈا میں باقاعدہ موسم سرما کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا اور سردی کی محسوساتی سطح منفی بیس درجے کو چھو گئی۔ ''اصل'' سردی کیا سلوک کرے گی، معلوم نہیں۔ ظاہری انسانی زندگی، بہر صورت، کرۂ ارض کے اسی سرد و گرم دشت کے سفر سے عبارت ہے اور بدلتے موسموں کی کہانی سناتی ہے۔

مگر عمران بھائی: وقت گواہ ہے کہ موسموں کا تغیر اور حالات کی تبدیلیاں ہم سب کے محبوب جریدہ ''بیاض'' کی باقاعدہ اشاعت پر کبھی منفی طور اثر انداز نہیں ہو پائیں۔ یہ ادبی رسالہ جس تواتر اور آب و تاب سے عشروں سے شائع ہو رہا ہے وہ لائق صد تحسین ہے اور آپ کا ایک تابندہ کارنامہ ہے۔ آپ نے محترم خالد احمد صاحب کے خواب کو جس انداز میں تعبیر آشنا کر رکھا ہے وہ محبت کے باب میں اپنی مثال آپ ہے۔ پاکستان اور بیرون پاکستان کے ادیبوں کی تازہ ترین تخلیقات کا یہ مرقع فی الواقع ادب کا اشاریہ ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کی قیادت میں ''بیاض'' کی مجلس انتظامیہ زیادہ سے زیادہ کاوشوں کو شامل اشاعت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور بڑے شہروں اور معتبر ناموں کے ساتھ ساتھ دور دراز کے قصبات اور ملک سے باہر رہنے والے نئے اور سینئر لکھاریوں کی تحریروں کو بھی برابر شائع کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ بے حد خوش آئند سوچ اور اقدام ہے۔

چند ماہ غیر حاضری کے بعد ''بیاض'' کے خوش رنگ تخلیقی گلدستے کے لیے میں بھی اپنی ایک تازہ غزل کے چند پھول ارسال کر رہا ہوں۔ امید کہ اشعار پسند آئیں گے اور نزدیکی اشاعت میں جگہ پائیں گے۔

یاد آیا، کچھ ہفتے ہوئے ''بیاض'' کے لیے ایک مضمون بھی ای میل کیا تھا۔ اسے بھی کسی مناسب وقت شائع کر دیجیے گا۔ بے حد شکریہ   نیاز مند:

حامد یزدانی
(کینیڈا سے)

گھر کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے
صرف رشتے بچا کے بیٹھ گئے

....

کینیڈا کے قصبہ واٹرڈاؤن میں سال دو ہزار پچیس کے موسمِ خزاں کے کنارے بیٹھا آج میں پاکستان کے دل لاہور میں مقیم اپنے عزیز اور نوجوان شاعر دوست اکمل حنیف کا اولین اردو شعری مجموعہ ''ردِ عمل'' پڑھ رہا تھا جو رشتوں کی قدر قیمت اور ان کی ناقدری کے دُکھ سے عبارت ہے۔ عزیز تخلیق کار دوست جناب نوید صادق کے توسط سے میرے حلقۂ احباب میں شامل ہونے والے اس نوجوان شاعر کی تخلیقی کاوشوں پر نظر ڈالتے ہوئے بعض

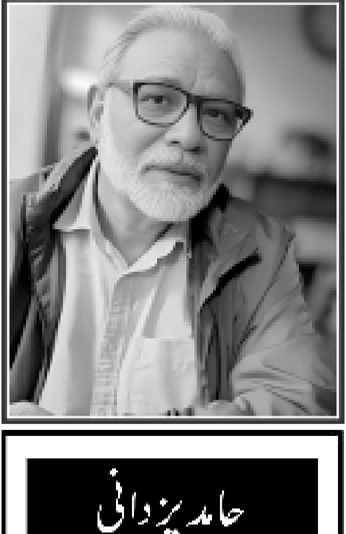

حامد یزدانی

مقامات تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شعر نہیں کہہ رہے معاشرہ میں بدلتی قدروں کے ہاتھوں ٹوٹنے والے احساسات کے نازک شیشے کی کرچیاں چن رہے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یہ کرچیاں ہاتھ کو نہیں بل کہ دل کو زخمی کرتی ہیں اور نتیجتاً آنکھیں نہیں، دل روتا ہے، خون کے آنسو روتا ہے- اسی لیے شاعر کا حساس دل رشتوں کو کسی نہ کسی صورت، کسی نہ کسی قیمت پر بچا لینے کی خواہش رکھتا ہے- ''ردِ عمل'' نے یوں تو کئی جگہ مجھے روکا مگر جانے کیوں زیادہ دیر میرا خیال درج بالا شعر کی نرم گرم چھاؤں میں بیٹھا رہا اور اس نے غیر محسوس طور پر میری سوچ کا رُخ شاعری سے سوشیالوجی کی جانب موڑ دیا- سوشیالوجی وہ مضمون ہے جسے میں نے برسوں پڑھا اور پڑھایا ہے- کینیڈا سے ماسٹرز آف سوشل ورک کی ڈگری حاصل کرنے سے برسوں قبل میں نے سوشیالوجی ہی میں اپنا پہلا ایم-اے کیا تھا-

یہ شعر پڑھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ سوشیالوجسٹس یا سماجیات کے ماہرین کے نزدیک بھی تو سماج رشتوں کے تانے بانے سے تشکیل پاتا ہے اور ان تمام تر رشتوں کی بنیاد سماجی تفاعل یا بین عمل پر استوار بتائی جاتی ہے اور یہ سماجی تفاعل 'عمل' اور 'ردِ عمل' کے تال میل سے ظہور پزیر ہوتا ہے- جیسے 'سوال' ایک عمل ہے اور 'جواب' اس کا ردِ عمل تو 'گفت گو' یا بات چیت ان کا نتیجہ- یعنی اگر ردِ عمل نہ ہو تو کلام ہی کلام ہوگا 'مکالمہ' کبھی پیدا نہ ہو سکے گا- ایک ہی ہاتھ کو چاہے کتنے ہی زور سے ہوا میں ہلاتے جایئے کوئی آواز پیدا نہ ہوگی جب تک کہ دوسرا ہاتھ اس سے ٹکرائے گا نہیں- جیسے ہی دوسرا ہاتھ پہلے سے ٹکرائے گا فضا تالی سے گونج اُٹھے گی اور ماحول کچھ وقوع پزیر ہونے سے آشنا ہوگا- اسی سماجی تفاعل یا بین عمل کی عارضی صورتیں جب مستقل شکل اختیار کرتی ہیں تو سماجی ادارے جنم لیتے ہیں، معاشرتی نظام وجود پاتا ہے اور ثقافت کی خوشبو نمو پاتی ہے جس کی رنگارنگی سے ایک جغرافیائی خطہ ہی نہیں سارا کرۂ ارض متنوع عقائد و نظریات، فکر و فن، زبان و بیان، تعمیرات، سیاسیات اور باہمی تعلقات سے مہک اٹھتا ہے- یوں دیکھیں تو دنیا کا سارا نظام ہی سماجی تفاعل یا بامعنی رابطہ پر قائم ہے- اسی تفاعل کے بطن سے تعاون، مسابقت اور تصادم جیسے عوامل جنم لیتے ہیں جن کی صورت پزیری کا مشاہدہ ہم اپنی روزمرہ کی گھریلو اور پیشہ ورانہ زندگی میں بھی کر سکتے ہیں اور مختلف ملکوں کے باہم تعلقات کی نوعیت میں بھی-

سوشل میڈیا پر جابجا دندناتی نام نہاد 'انسپریشنل سپیکرز' کی فوج کو بھی آپ نے اکثر یہ بات کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ معاملہ کیا رُخ اختیار کرے گا؟ اس کا ایک فی صد انحصار

آپ کے عمل پر جب کہ ننانوے فی صد ردِ عمل پر ہے۔ افسوس، یہ مقررین اپنے 'فالوورز' بڑھانے کی مسابقت یا دوڑ میں ایک دوسرے سے الجھتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ خاص کر جب ان کے دلائل کمزور پڑنے لگیں۔ انھیں ایسا محسوس ہونے لگے کہ وہ ہارنے والے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ کہ ایسے 'رہنماؤں' کو سننے سے کیا حاصل جو 'سپورٹس مین سپرٹ' ہی سے محروم ہیں۔ اکمل حنیف تو پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں:

ایسے لوگوں کی حمایت نہیں کرنا مجھ کو
لڑ پڑیں، کھیل میں جب ہار نظر آنے لگے

....

سوشل میڈیا پر 'واہ، واہ' سمیٹنے والے ان 'اداکاروں' کی مواصلاتی قربت کے بجائے کیوں نہ ایسے پرانے اور مخلص دوستوں کی صحبت میں چند گھڑیاں بسر کی جائیں جن کے بارے میں ہمارے شاعر کہتے ہیں:

بھول جاتا ہوں مسائل میں زمانے کے سبھی
اک غنیمت ہیں مرے دوست پرانے والے

....

دوستوں کی انھی بے لوث قربتوں کا ذکر حضرت یزدانی جالندھری نے اپنے مجموعہ ''توراتِ دل'' میں یوں کیا ہے:

غنیمت ہے جو کچھ لمحے کو چند احباب مل بیٹھیں
وگرنہ اس زمانے میں میسر ہے کہاں یہ بھی

....

واقعی، اب 'اصل' ملاقاتیں کم کم ہی ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بالمشافہ رابطوں کی جگہ اب برقی رابطے لیتے جا رہے ہیں اور یہ بھی غنیمت ہے کہ کچھ رابطے باقی تو ہیں۔ سلام دعا کی کوئی صورت تو باقی ہے ابھی۔

سماجیات کے تناظر میں دیکھیں تو 'السلام علیکم' اور 'وعلیکم السلام' کے خیر سگالی اور محبت بھرے رابطہ سے لے کر کھیلوں کے مقابلوں تک، پاک۔ چین دوستی سے لے کر پاکستان اور بھارت تصادم اور عرب۔ اسرائیل تنازعہ تک یہی 'سماجی تفاعل' اپنی کسی نہ کسی صورت میں کارفرما ہے؛ کہیں تعاون کی صورت میں، کہیں مسابقت کی شکل میں اور کہیں تصادم کے روپ میں۔ ذرا سا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ دوطرفہ دوستیاں اور باہمی دشمنیاں کسی نہ کسی عمل کے ردِعمل ہی کا نتیجہ ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا انھی روابط کی صورتیں ہمارے منضبط سماجی ادارے ہیں جن میں 'خاندان' کو متفقہ طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ یہی وہ ادارہ ہے جس میں انسانوں کی اکثریت کی افزائش اور اساسی تربیت ہوتی ہے۔ یہیں سے انسان زندگی کے شعوری سفر کے پہلے زینہ پر قدم رکھتا ہے، جذبہ واحساس سے تعبیر رشتوں کی ڈوری سے منسلک ہوتا ہے اور شخصیت سازی کے سادہ و پُر پیچ بہاؤ میں ہاتھ پاؤں مارنے کی سعی کا آغاز کرتا ہے۔ اس مرکزہ سے حاصل ہونے والی سرد مہری اور گرم جوشی کی دولت اور نفرت و محبت کے سکے ہی بسا اوقات وہ

عمر بھر دوسروں میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔

دل چسپ امر یہ کہ ہماری اردو شاعری کا دامن بھی ان بنیادی رشتوں کے تذکرہ سے محروم نہیں مگر یہ ذخیرہ ہمیں بہت حد تک 'نظم' تک محدود دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ماں کے حوالہ سے حضرت اقبالؒ سمیت متعدد اہم شعرا کی نظموں سے آگاہ ہیں۔ اسی طرح والد اور دیگر رشتے بھی 'منظوم' صورت میں مل جاتے ہیں۔ مگر ہماری اردو غزل کے حضور 'محبوب' کے علاوہ کوئی بھی اور باریابی نہ پاسکا۔ میں اپنے عہد کی جانب دیکھتا ہوں تو پاکستان کی حد تک یا کہہ لیجیے کہ اپنے آس پاس اوّل اوّل میں نے عارف عبدالمتین، حفیظ صدیقی، زاہدہ صدیقی، راسخ عرفانی، خالد احمد اور چند ایک اور شعرا کے ہاں ان خوب صورت رشتوں کا جمال آفریں اظہار دیکھا۔ ماں باپ کی محبت کا موضوع خیر بعد کے شعرا نے 'مسابقت' کے جذبہ کے تحت خوب ''اچھالا'' مگر دوسرے رشتے ان کے اشعار میں خاطر خواہ جگہ نہ پاسکے۔ ہاں، بھائیوں کا بازو ہونا یا 'شریکا' ہونا کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ مگر یہاں میں اپنے دوست شاعر اکمل حنیف کو خصوصی داد دینا چاہوں گا جنھوں نے اپنے شعری مجموعہ ''رد عمل'' کا انتساب بھی ان خوب صورت رشتوں کے نام کیا ہے اور پھر جابجا ان خوب صورت رشتوں کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ چند اشعار آپ بھی پڑھیے:

دیکھتا ہوں جب بھی اکمل پیڑ تپتی دھوپ میں
مجھ کو آتی ہے نظر اس میں شباہت باپ کی

دل زمانے میں جب لگا نہ کہیں
ماں کے پہلو میں جا کے بیٹھ گئے

....

توڑ دے جسم و روح کا بندھن
میرا وہ سانس آخری، تم ہو

....

تھکن کافور ہو جاتی ہے دن بھر کی
مرے بچو! تمھارے مسکرانے سے

....

بچوں کی یہ ان مول مسکراہٹیں، والدین کی دعائیں اور باوفا شریکِ سفر کا پیار--- یہ سب اس مرکز کی دین ہیں جسے ہم خاندان کہتے ہیں۔ یہی افراد کے بنیادی روابط کا منبع ہے۔ اس امر سے کون انکار کرسکتا ہے کہ معاشرہ کا سارا 'کاروبار' ہی روابط اور ان کے نتیجہ میں قائم ہونے والے رشتوں پر چل رہا ہے۔ یہ رشتے اور تعلقات جس نوعیت کے ہوتے ہیں اُسی نوعیت کا طرزِ عمل اور برتاؤ ہم فریقین میں دیکھتے ہیں۔ کہیں ہمیں محبت کے گلاب مہکتے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں نفرت کے خار۔ کہیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش ہے تو کہیں دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ۔ افسوس، اب بہت سے قریبی رشتے مادی ضروریات اور مطلب براری کی نذر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اکمل حنیف کے ''ردِعمل'' کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

رنگ بدلا ہے لہو کا بھی زمانے کی طرح
اب تو بھائی بھی ضرورت کے سبب ملتے ہیں

انسان کو ایک سماجی جاندار یا معاشرتی مخلوق بھی کہا جاتا ہے- وہ سماجی زندگی کے مشاہدات اور تجربات سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کی فکر، اس کی سوچ اور اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے- ہم دیکھتے ہیں کہ پھول دنیا کے کسی بھی خطہ میں کھلے وہ رنگ وخوشبو ہی لٹاتا ہے- یہی عالم محبت کا ہے- اس کی افادیت بھی کسی خطہ، عقیدہ یا سماج سے مشروط نہیں- یہ بھی ہوا کی طرح عالم گیر ہے- ماں بیٹے کے معصوم پیار سے پھوٹتی دل کش شعاعیں عمر بھر انسان کا ساتھ دیتی ہیں- انہی شعاؤں کا گزر جب طیفِ شباب میں سے ہوتا ہے تو وقت کے افق پر عشق ومحبت کی ہفت رنگ دھنک پھیل جاتی ہے اور یہی رنگ بزرگوں کی شفقت بھری چادر سے مَس ہوتے ہیں تو حرفِ دُعا کی صورت سات آسمان عبور کر جاتے ہیں- ان دعاؤں میں ماں کی دعا مؤثر ترین ہوتی ہے اور جسے اس کا حصار مل جائے اُس جیسا خوش بخت اور کون ہوگا؟

پریشانیاں دور رہتی ہیں مجھ سے
میں رہتا ہوں ماں کے حصارِ دعا میں

....

دل زمانے میں جب لگا نہ کہیں
ماں کے پہلو میں جا کے بیٹھ گئے

....

ماں کی دعا اور قُرب کے پہلو ہی میں تو باپ کی محبت وشفقت کا سرسبز پیڑ ایستادہ ہے-

باپ جیسا لگا مجھے اکمل
جب بھی اس پیڑ سے ملا ہوں میں

....

یہ امر بھی اپنی جگہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ دنیا کثیر رنگی ہے- یہاں صبح بھی ہے اور شام بھی، دن بھی ہے اور رات بھی، محبت بھی ہے اور نفرت بھی، سخاوت بھی ہے اور بخیلی بھی، فراخ دلی بھی ہے اور تنگ نظری بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی- وقت اور جذبات کی یہ بوقلمونی ہی زندگی کے بہاؤ کی ضامن وگواہ ہے- کہیں ہمیں یگانگت کا گیت سنائی دیتا ہے اور کہیں بے گانگی کا ترانہ- کہیں پیار کا نغمہ گونج رہا ہے اور کہیں جنگ کا طبل- ذرا قریب سے مشاہدہ کریں تو لامحالہ یہ سب کسی نہ کسی ''ردعمل'' ہی کا شاخسانہ نکلتے ہیں-

یہاں ایک طرف والدین سے دعائیں لینے والے اور ان کی اطاعت کرنے والے بچے ہیں اور دوسری جانب زمانے کی چال کو نہ سمجھنے والی نادان اور مطلبی اولاد جن کے اعمال پر 'ردعمل' کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے شاعر اکمل حنیف کا قلم بھی آنکھوں کی صورت اشک بار ہو جاتا ہے:

نہیں کوئی جو بوڑھے باپ کے جذبات کو سمجھے
سبھی کو ہے وراثت میں لکھی تحریر سے مطلب

....

ماں باپ کی نشانی تھا کل تک جو ایک گھر
بچوں نے بیچ ڈالا ہے حصے نکال کر

....

کاٹ ڈالو مری شاخوں کو مگر دھیان رہے
تم نے اک عمر گزاری ہے مری چھاؤں میں

....

جیسے ناخلف اولاد ماں باپ کی قدر نہیں کرتی اسی طرح بے حس معاشرے اپنے افراد کی ضروریات کو نظر انداز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وقت گواہ ہے کہ جس معاشرہ سیرواداری وانصاف کی فصل کاٹ دی جائے وہاں ظلم، جبر اور ناانصافی کے سرکنڈے ہی اگا کرتے ہیں جو خشک ہو کر مزید آگ بھڑکانے ہی کے کام آتے ہیں۔ نہ ان سے سکون کا رزق حاصل ہوتا ہے اور نہ امن طروات۔ جو افراد، جو خاندان اور جو معاشرے اس آگ کی تپش سے دوچار ہوتے ہیں ان کے اندر باہر سوائے نفرت اور غصہ کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ آپ باہم دست وگریباں بھائیوں کو دیکھ لیجیے، منافق دوستوں پر نظر ڈال لیجیے، لڑتے ہوئے قبائل کا جائزہ لے لیجیے یا پھر جنگوں میں ملوث ممالک کی تاریخ پڑھ لیجیے۔ جذبوں کی زیریں لہروں کے دوش پر 'عمل' اور 'ردعمل' کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے طوفان ہی دکھائی دیں گے۔

ایسے منفی ماحول پر ایک باشعور تخلیق کار کا 'ردعمل' کتنا فطری ہے! آپ بھی دیکھیے۔ کبھی تو وہ سر پھری ہوا کے مقابل اپنی ہمت کا چراغ جلا کر رکھ دیتا ہے:

آندھیاں دکھا رہی تھیں مجھے سر پھری ہوا
رکھنا پڑا چراغ جلا کر منڈیر پر

....

اور کبھی اس کا 'ردعمل' بے حسی کی اذیت ناک خاموشی میں احتجاج کی چیخ بن کر گونجنے لگتا ہے:

اک اذیت ہے یہ خموشی بھی
اس لیے روز چیختا ہوں میں

....

ہاں، دل دکھانے کا عمل کسی دوست سے سرزد ہوا ہو تو اس کا ردعمل مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ ردعمل کی یہ صورت دیکھیے:

کاٹ دیتا ہے وہ میری بات جب
مسکراہٹ ، خامشی ردِّ عمل

....

اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حساس شاعر کا اظہار محض حرف احتجاج تک ہی محدود نہیں رہتا وہ اپنے ماحول کو، اپنے سماج کو اقبالؒ کی ہم نوائی میں خیر کا، خودی کا سبق بھی یاد دلاتا ہے، انھیں مسائل کے حل کے لیے عملی قدم اٹھانے کی تعلیم بھی دیتا ہے اور ارباب بست وکشاد کو بھی زبانی دعووں سے آگے بڑھ کر عملی قدم اٹھانے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

خودی کا فلسفہ اکمل سنا کر
میں لوگوں کو جگانا چاہتا ہوں

....

مسائل حل نہیں ہوتے فقط 'حل' بولنے سے
زباں میٹھی نہیں ہوتی کبھی 'پھل' بولنے سے

ہمارے مسئلوں کا حل اگر ممکن نہیں تو پھر
ترے جلسوں، ترے دعووں، تری تقریر سے مطلب؟

....

ہم جانتے ہیں کہ شاعر سماجیات کے ماہر سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ وہ ظاہری اور سائنسی عوامل کے اسباب وعلل کی تہوں میں بہتے احساسات اور امکانات کا احاطہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ وہ عروج وزوال کی رسمی داستانوں اور نفرت ومحبت کے غیر رسمی قصوں کے الفاظ پر ہی غور نہیں کرتا بلکہ ان کے بین السطور متن کو بھی اپنے قلب وذہن میں جذب کر لیتا ہے۔ وہ محض نوشتۂ دیوار ہی نہیں پڑھتا بلکہ پس دیوار بھی دیکھنے لگتا ہے اور یہ کارنامہ اُس کی تخلیقی آنکھ انجام دیتی ہے:

تیری آنکھوں سے زمانے کو میں دیکھوں، اکمل
اور مجھ کو پس دیوار نظر آنے لگے

....

اور اس عمل میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے اسے وہ اپنے تخلیقی وجدان کی راہداریوں سے گزارتے ہوئے فن کے قلعہ تک لے جاتا ہے جہاں سے اُسے اظہار کا وہ فقیرانہ وثیقہ حاصل ہوتا ہے جس پر شاہانِ جہاں بھی ناز کرتے ہیں۔ مگر سچا تخلیق کار اپنے اندر اس فقیر کو ہمیشہ جگائے رکھتا ہے جو دنیاوی حرص وہوا، مفاد پرستی اور خود غرضی سے متنفر ہے اور قربانی، خدمت اور اخلاص کے جذبے سے سرشار ہے۔

کاش زمانہ ایسے درویشوں کی قدر کرے جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں

مل گئے ہیں تو کرو قدر ہماری لوگو
ہم سے درویش تو قسمت کے سبب ملتے ہیں

....

سچی بات یہ کہ شاعر کی یہی درویشانہ طبع اس سے حمدِ باری تعالیٰ کے ایسے دل پزیر اشعار لکھواتی ہے:

خدا کی حمد وثنا لاالٰہ الا اللہ
ہر ایک غم کی دوا لاالٰہ الا اللہ

یہ ہوگئی مرے ایمان کی گواہی بھی
ردیفِ حمد ہوا لاالٰہ الا اللہ

قبول ہونے لگی ہر مری دعا، اکمل
جو رو کے میں نے کہا لاالٰہ الا اللہ

....

دنیا اگر کلمہ طیبہ کے الفاظ میں چھپی محبت محسوس کر لے تو وہ اس کی عالم گیر کشش کے راز سے بھی آگاہ ہو جائے۔ دین سے سچی محبت اہلِ ایمان کی رگوں میں لہو کی طرح رواں دواں ہوتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ سے عشق ان کے سر کا تاج ہے۔ اہلِ عقل کی اس مقام تک رسائی ممکن نہیں۔

عشق وہ مسئلہ ہے دنیا کا
عقل والوں سے حل نہیں ہوتا

عقل سے انسان فن سیکھ سکتا ہے، عشق کرنا نہیں۔ اس کے لیے تو ایک پُر گداز دل درکار ہوتا ہے۔ ہاں، کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی فکر کو عشق رنگ بنا لیتے ہیں اور اپنے ہنر اور فن کو محبت آشنا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی فن کی معراج پانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کیوں کہ فن کی حقیقی معراج توصیفِ صاحبِ معراج ہے۔ حضرت حسانؓ و کعبؓ و زہیرؓ سے چلا نعت کا کارواں رومیؒ و سعدیؒ و جامیؒ تک پہنچا اور وہاں سے محسن و رضا و حالی و اقبال کو ساتھ لیتا ہوا ندیم و تائب و خالد تک پہنچا اور ان اکابر کے بابرکت الفاظ کے سائے سائے اب ہم سب اپنے اپنے انداز میں، اپنے اپنے رنگ میں نعتِ نبی گنگنا رہے ہیں۔ نعت کی اس دل خوش کُن فضا میں اکمل حنیف کی صدا کس خوب صورتی سے گونج رہی ہے۔ آپ بھی سُنیے:

مری آنکھوں میں ایسے بس گئے جلوے مدینے کے
کبھی دن رات آتے ہیں مجھے سپنے مدینے کے

مرے دل کی یہی ہے آخری خواہش کہ جیتے جی
میسر ہوں مجھے بھی روز و شب ان کے مدینے کے

نبیؐ کے در پہ صبح و شام ہوتی حاضری اپنی
اگر ہم لوگ بھی اکمل مکیں ہوتے مدینے کے

....

عقیدت و مودت کے یہ پاکیزہ جذبات ایک ایسے پاک صاف دل ہی کے مکیں ہو سکتے ہیں جو سراسر محبت ہو۔ اثبات اور خیر کا داعی ہو۔ امن و سکوں کا حامی ہو اور سب کی بھلائی کا خواہاں ہو۔ فرقہ وارانہ منافرت کے بجائے اخوت اور بھائی چارے پر یقین رکھتا ہو۔ جس کا عقیدہ منافرت کا نہیں بلکہ محبت کا پیامبر ہو۔ جو اللہ اور رسولؐ کے بعد اہلِ بیتؓ سے وفا کا بھی دم بھرتا ہو اور اصحابؓ رسول سے بھی اظہارِ محبت کرتا ہو۔ کیوں کہ ان سب سے محبت کے بغیر زندگی بیکار ہی تو ہے۔ چناں چہ ہمارا شاعر اپنی کاوشوں میں جہاں وہ آلِ رسول سے محبت کا دم بھرتا ہے وہیں اصحابؓ رسول سے محبت کو بھی کردار کا معیار قرار دیتا ہے:

جس کی نظر میں سارے صحابہؓ ہیں معتبر
میری نظر میں صاحبِ کردار ہے وہ شخص

....

حصولِ برکت کی نیت سے اپنے تاثرات کے آخر میں خوب صورت شاعر اکمل حنیف کے اوّلین اردو شعری مجموعہ کی اشاعت پر ان کے لیے ہی دعائیہ الفاظ لکھنا چاہتا ہوں جو میرے اوّلین اردو شعری مجموعہ "ابھی اک خواب رہتا ہے" (مطبوعہ 1992) کے فلیپ پر جناب خالد احمد نے میرے حرفِ اظہار کے لیے رقم کیے تھے
اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ کے صدقے اکمل حنیف کی کوشش کو بار آور رکھے۔ آمین ثم آمین!۔

☆☆☆☆☆

بشر تماشا ہے

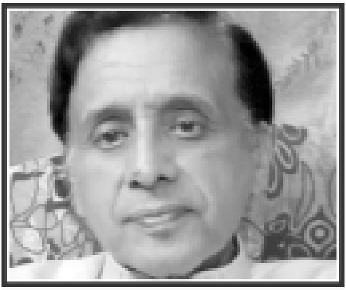

نثار ترابی کے مجموعے کا عنوان ''بشر تماشا ہے'' ہوتا تو بھی موزوں و مناسب ہوتا اس لیے کہ حمد، نعت اور منقبت کے فوری بعد یہی بازیافت نظر پڑتی ہے:

نظر اٹھی ہے جدھر بھی ، ادھر تماشا ہے
بشر کے واسطے جیسے بشر تماشا ہے

باقی اشعار اسی کے دلائل، اثبات اور شہادت ہیں۔ پتا ہے مجھے یہ شعر کیوں گرفتہ کر گیا کہ جس حساسیت کے ساتھ میں نے آنکھ کھولی تھی اس نے دائم یہی منظر دکھایا۔ ادھر تماشا، اُدھر تماشا۔ گھر میں، گلی میں، بستی، محلے، شہر، ملک اور دنیا بھر میں۔ اور تو اور اپنے اندر۔ یہ اندر والا تماشا اتنا کافی ہے کہ انسان ہرگز باہر نہ دیکھ پائے۔

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا
حقیقت میں جو دیکھنا تھا ، نہ دیکھا
(داغ)

صاحب! باہر دیکھیں گے تو یہی کچھ ہوگا۔ بشر کے واسطے جیسے بشر تماشا ہے۔ نہیں دیکھنا چاہتے، دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ تماشا ''بدوبدی'' آ آ کے سامنے پڑتا ہے بشر کا تماشا بنانے والے شوق، انہماک اور استغراق سے دیکھتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں۔ ہاہا کرتے ہیں اس ہاہا کار میں، مَیں اور نثار ترابی بس اتنا دیکھتے ہیں جتنا ڈبڈبائی آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ یہی وہ اشتراک ہے۔ نم دیدہ۔ اشک بار اور ڈبڈبائی آنکھوں سے برآمد ہوتی شفاف نظر جو نثار ترابی اور مجھے ایک زاویے پر کھڑا کرتی ہے۔ ان تماشوں پر آنسو وہ بھی بہاتے ہیں، روتا میں بھی ہوں۔ احتجاج وہ بھی کرتے ہیں چلاتا میں بھی ہوں۔ دہائی وہ بھی دیتے ہیں، فریاد میں بھی کرتا ہوں اور پھر ہم دونوں بشر دیگر بشروں کے واسطے تماشا بن جاتے ہیں۔ مگر یہ کہ یہی مقام بشریت ہے۔ انسانیت ہے تو مقام شکر بھی یہی ہے۔ شعر اشک نہ ہو، فکر آنسو نہ ہو دل تپیدہ نہیں نظر نم دیدہ نہیں تو شاعری نہیں۔ نثار ترابی اس منصب کی شاعری کرتے ہیں۔

جو بشر بشر کا تماشا بناتے ہیں، بشر کا تماشا کرتے

عرفان جمیل

ہیں فطرت کا تماشا کرنے سے یک سر محروم رہتے ہیں، ایسوں کے لیے اقبالؒ نے دعا کی تھی:

محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

....

میں نے نثار ترابی کے تازہ مجموعہ شعر ''خوشبو آواز دیتی ہے'' کے انتساب ہی میں دیکھ لیا کہ حضرت کم از کم محرومِ تماشا گروہ میں شامل نہیں تبھی اس کی تمنا، پنچھیوں کی آزادی، شاخوں کی شادابی، علم، مہکتے والانوں، خواب زاروں کی آبادی، خیر کے چشموں، عدل کی تیسیر ان کے انتساب میں آرزو، دعا اور مناجات کی صورت شعر بن گئی ہے، معراج یہ کہ فرماتے ہیں:

خوشبوؤں پر کوئی قید نہ ہو
بچوں کے کھولنے ستے ہوں

....

ہائے! کلیجہ منہ کو آیا۔ اے شاعری دردمند۔ اے سوزِ محبت سے مالا مال نثار ترابی! آپ پر تحسین کے تمام حرف نثار۔ آپ نے حروف کو لفظ کیا، الفاظ کو شعر، اشعار کو درد کیا:

ابھی تو کاٹ رہے ہیں زمیں پہ قیدِ حیات
کریں گے پار بھی یہ پل صراط پنچھی واس

مَیں ان کو دیکھ کے اکثر یہ سوچتا ہوں نثار
غموں سے پائیں گے کیسے نجات پنچھی واس

....

یہ ردیف ..... اللہ اللہ ___ آمد بھی ہے آورد بھی ___ آمدیوں کہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ آورد اس طرح کہ یہ دہائیوں کے کشٹ کا فیض ہے۔ کر کر دکھائے کوئی اس طرح:

تو نے شاید کبھی دیکھا نہیں دکھ سائے کا
دھوپ ڈھلنے سے بھی ڈھلتا نہیں دکھ سائے کا

....

یہ شاعر سائے تک کا دکھ جانتا ہے۔ انقلابی ہے؟ ہوگا، رومانی ہے؟ ہوگا ___ ترقی پسند ہے؟ ___ ہوگا۔ سب کچھ ہوگا۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ شاعر ہے۔ ''سچا، پکا تے ڈونگھا'' ___ اس کی گہرائیاں اس مجموعے میں یوں ہیں کہ آپ کسی سمت بس اپنے دھیان میں خراماں ہوں اور ..... اور ..... رہ رہ کر ''خوشبو آواز دیتی ہے'' ___

اس قدر تنہائیاں تھیں جا بجا گھر میں مرے
مَیں نے ہر دیوار پر چہرہ بنا کر رکھ دیا

....

پھر وہ ان چہروں کی شناخت میں مگن ہو جاتے ہیں۔ گھر کی دیوار، گھر کے در سے چہرہ شناسی کی ابتدا کرتا نثار ترابی کائنات اور اس سے پرے نکل جاتا ہے۔ کڑی دوپہر کو عبدالکریم جیلی کی طرح ہتھیلی پر چراغ لیے بھرے بازار، بھری دنیا میں ایک ایک چہرہ تاک تاک کر دیکھتا پھرتا ہے ___ وہ جنھیں خرید و فروخت سے فرصت نہیں پوچھتے ہیں دن کے اُجالے میں چراغ لیے پھرتے چہرے تکتے ہو۔ میاں کیا دیکھتے ہو؟ ارشاد ہوتا ہے ___ آدمی ___ آدمی؟ ___ یہ بازار دیکھتے ہو۔ یہاں سے وہاں حدِ نگاہ انسانوں سے بھرا ہے، انسانوں سے پُر ہے۔ اس ہجوم، اس ازدحام میں انسان ڈھونڈتے ہو؟ ___ فرماتے ہیں ''نہیں ___ ان میں آدمی ڈھونڈتا ہوں ___ ایک بھی نہیں ___'' ہائے ___ عبدالکریم جیلی ہوں، نثار ترابی یا میں ___ اپنا دھندہ یہی ہے ___ آدمی پر ایک نہیں

ملتا۔ وہ جسے خالق، آدمی کہے___ وہ جسے اس کا سفیر، اس کا رسول، آدمی کہے___ اس کی کتاب آدمی قرار دے___ لد گئے___ اب ہم رو ہیں نہیں، چیخیں نہیں، دھاڑیں نہ ماریں تو کیا کریں، اردگرد یہ پھول، شاخیں، پرند نہ ہوتے تو ہمارے اشک کیوں کر تھمتے:

خدا کرے کہ سلامت رہیں یہ شہر پرند
اُترتے دیکھوں سدا کارواں پرندوں کے

....

پرندوں کے کارواں، چہکار، پھول، بن___ پھولوں کی مہکار نثار ترابی کی دل بستگی کو کافی تھی کہ اُسے تو ہمیشہ "خوشبو آواز دیتی ہے" مگر صرف گلوں کی باس پر بس نہیں وہ تو جذبوں کی خوشبو، خلوص اور احترام کی بوباس کا متلاشی ہے۔ مگر یہ کہ یہ سب لٹ چکا۔ درودیوار کی خیالی دنیا کیا کرے اُسے تو پہرے دار سے گلا ہے کہ سب لٹ رہا تھا تو وہ کہاں تھا؟___ لٹ چکا اور لٹیرے دندناتے پھر رہے ہیں۔ پھر چپ کیوں؟ خاموش کس لیے___ اور تابہ کے___

لٹیرے دندناتے پھر رہے ہیں
تعجب ہے کہ پہرے دار چپ ہے

....

ایک دانش ور نے کہا تھا تعجب ہے کہ تمھیں جو تعجب تک نہیں ہوتا___ تو نثار ترابی حیران ہوتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں، متعجب ہوتے ہیں تو شاعر، دانش ور، محقق، ادیب اور سچے، کھرے، حساس انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں___ لوگو! جس دن یہ دعویٰ بھی مفقود ہوا___ اذا زلزلت الارض زلزالھا کی ساعت آ موجود ہو گی___ لوگو! القارعۃ پڑھا کرو___ نارحامیہ سے بچنا ہے تو کتاب ہدایت سے اَفلا تشعرون کا سبق لو___ نثار ترابی اور میں ابھی درس میں بیٹھ چکے، کہیں سے سر نکال کر بھاگتی خلقت سے خطاب ہوتا ہے:

اتنا نہ تیز بھاگ، نہ یوں پائمال کر
کتنے نگوں کے میل سے بنتا ہے راستا

جواب آتا ہے___ تجھے کیا ملا___؟
یہ تنگ کر کہتے ہیں:

اک یہی آگہی کا حاصل ہے
درد ہی شاعری کا حاصل ہے

....

اسی درد کی دین ہے کہ نثار ترابی کہتے ہیں:

کب پیامِ خیر کی ہو گی منادی دہر میں
کب زمیں پر امن ہو گا سوچتی ہے فاختہ

....

مگر فاختہ کی سوچ تک پر پہرے ہیں___ بے چارگی ہے کہ ہم سہم کر سب دیکھ رہی ہے۔

ہونے والا ہے کیا خدا جانے
پھر رہے ہیں نقاب بستی میں

....

الاماں___ الحفیظ___ وہ وہ کچھ ہو رہا ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا۔

ہم جو بازار سے اخبار اُٹھا لائے ہیں
ایسا لگتا ہے کہ آزار اُٹھا لائے ہیں

....

آہا___ کیا شعر ہے___ واہ نثار ترابی___ پورے عہد کا نقشہ___ پورے تماشے کا خلاصہ___

نظر اُٹھی ہے جدھر بھی اُدھر تماشا ہے
بشر کے واسطے جیسے بشر تماشا ہے

☆☆☆☆☆

اقبال احمد کا قمر نامہ

ریاض روڈ اور ابو حیدریہ روڈ کے سنگھم پر الفیصلیہ کے سامنے ایک انڈسٹریل ایریا ہے۔ وہاں ایک سیمنٹ فیکٹری کے ایک رہائشی فلیٹ کے بڑے سے ہال میں ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اقبال قمر سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ نکلا ہوا قد، مسکراتی آنکھیں، سوہنا چہرہ، خمار آلود آواز، پُراعتماد خوش دل، مہذب اور کھلا ڈھلا۔ مل کر قدرے تسلی ہوئی۔ پہلی بار جب میں دمام ایئرپورٹ سے باہر نکلا تا میرے استقبال کے لیے میرے بہنوئی محبوب اور ان کی چھوٹی سی بیٹی فاطمہ موجود تھے۔ ہم سیدھے محبوب کی مشین شاپ گئے۔ فاطمہ نے ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر بہت ہی مزے سے کہا۔

"ماموں! یہ وہ جگہ ہے جہاں انسانوں کا لوہا بنایا جاتا ہے۔"

قمر نے اپنی اڑتیس سال سے زیادہ زندگی اس سیمنٹ فیکٹری میں گزار دی۔ دن رات پتھر سے زیادہ سخت بلاک بنائے۔ لیکن خود سیمنٹ بنا نہ پتھر، بل کہ چکنی مٹی بنا رہا اور کئی حسن کوزہ گر استفادہ کرتے رہے۔ ہم رسمی گفتگو سے ایک قدم آگے بڑھے تو قمر نے اپنی بے صبری کا اظہار کیا۔

"اپنا کچھ کلام سنائیں"

میں نے سوچا اسے پوری دیگ کھلانے کی ضرورت نہیں کہ مصداق ایک شعر سنا دیتا ہوں جواب آں شعر کے طور پر پھر اس کی پوری غزل سننا پڑی۔ اس کا ایک شعری مجموعہ "شام کی زد میں" آچکا تھا۔ وصولا۔ اللہ اللہ خیر صلا "شام کی زد میں" ایک سو بارہ صفحات کی کتاب ہے۔ چوتھائی حصہ مضامین کا الگ کر دیں تو پیچھے کتابچہ ہی بچتا ہے۔ ذکاء صدیقی اور اقبال کوثر کے مضامین ہیں۔ ایک استاد اور دوسرا دور پار کا رشتہ دار۔ اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ فلیپ کی پونے چودہ لائنیں تھیں، یوسف

سعید اشعر

حسن نے لکھیں- وہ بھی ان کے شہر دار، بڑی
مایوس ہوئی- پاس کوئی ڈائجسٹ بھی نہیں
مجبوری تھی- بے دھیانی میں کتاب کی ورق
گردانی کرنے لگا- طبیعت میں غیر واضح
انداز میں تبدیلی محسوس ہونے لگی- لفظوں
سے روشنی پھوٹنی شروع ہوگئی- کانوں میں
بارش کی بوندوں کی کن من کن کن کی آواز
پڑنے لگی- کچی مٹی پر پانی کے چھینٹے پڑنے
سے اُٹھنے والی مہک آنے لگی- یہ کتاب نہیں
کوئی الگ ہی ہی دنیا ہے- جس کا اپنا ماحول
اور موسم ہے- سب سے جدا تہذیب ہے-
غنائیہ، نشاطیہ اور حزنیہ جذبات میں رچی بسی
فضا ہے - سمجھ میں آنے والے جمالیاتی
تجربوں کا اک جہان ہے-

ذکاء صدیقی کا اگر کوئی ادبی سلسلہ ہے تو قمر
اس کا واحد خلیفہ ہے- اس نے اپنے مرشد
سے جھولیاں بھر بھر کے فیوض و برکات
حاصل کیے- مرشد کی صحبت نے قمر کا سینہ
روشن کر دیا- شعر وسخن کی منزلیں آسان ہو
گئیں- قمر پر حقیقت آشکار ہوتی چلی گئی-
اس نے بھی مرشد کی وفات کے بعد ان کے
ادبی سلسلے کو جاری و ساری رکھا - مرشد
بھائیوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ ارد گرد
باقی ادب کے پیاسوں کی پیاس بجھائی-
اپنے دل سے مرشد کی محبت کو کبھی کم نہ ہونے
دیا- ان کے تبرکات کو ”آج کی شب پھر سناٹا“
اور ”کلام غالب کا فنی و جمالیاتی مطالعہ“ کی
صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا-

ایک روز اقبال قمر مجھے پہلی بار ملنے میری
رہائش پر آیا- میں اسے لینے باہر روڈ پر گیا-
ہمارے رہائشی بلاک کی بلڈنگیں پانچ منزلہ
تھیں - جب میں اسے لے کر پانچویں
منزل پر پہنچا تو پتہ چلا غلط بلڈنگ میں آ گیا
ہوں- یہ بتانا شاید میں بھول گیا کہ ان
بلڈنگوں میں لفٹ نہیں تھی-

ہماری پندرہ سالہ دوستی میں اقبال قمر پھر
میرے گھر کبھی نہیں آیا- حالاں کہ میں چھ
سات بار اپنا گھر بدل چکا ہوں-

میں اور قمر جہیل سے مشاعرہ پڑھ کر واپس
لوٹ رہے تھے- راستے میں قمر نے کہا-
”یار! تم نے ”نہ“ کو دو حرفی باندھا ہے-
یہ جائز نہیں- اس کا یک حرفی استعمال ہی
جائز ہے-“

”قمر بھائی! ہمارے ہاں نہ، کہ اور پہ کا
استعمال دونوں طرح جائز ہے-“

یار! تم ایسی باتوں سے گریز کرو جو متنازعہ
ہوں- کس کس سے بحث کرتے رہو گے-
اس طرح دوسروں پر اچھا تاثر نہیں پڑتا-“
قمر کی یہ بات میرے دل کو لگی-
اس کی تجویز پر حرف ندا ”یا“ اور ”اے“ کو
بھی دو حرفی باندھنے لگا-

اس کا ذوق سلیم بہت ہی اعلیٰ ہے- بہت
دفعہ ایسا ہوا کہ کسی شعر کے ایک مصرع کی
بیک وقت کئی صورتیں میرے سامنے
آئیں- میں نے اکثر اس سے مشورہ لیا-
میں ہمیشہ اس سے الفاظ کے تلفظ اور مختلف

بحروں میں زحافات کے حوالے سے بھی تبادلہ خیال کرتا ہوں علم وعروض پر اس کی بڑی گہری نظر ہے۔ میں ذاتی طور پر بہت سارے ایسے عالمی شہرت یافتہ شاعروں کو جانتا ہوں۔ جنھیں اب بھی ڈھنگ سے ایک مصرع کہنا نہیں آتا۔ قمر سے اصلاح لینے کے بعد وہ اپنے وسائل کی فراوانی کی وجہ سے پوری دنیا میں عالمی مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ایک ایک مصرع اس سے سیٹ کروانے کے بعد دھڑا دھڑ اپنے مجموعے چھپواتے رہے۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ملی کہ کہیں اپنی کسی کتاب میں ایک بار شکریے کے ساتھ اس کا نام ہی لے لیتا۔ اپنے عالمی دورے پر جاتے ہوئے۔ اس کی دو غزلیں ہی کسی میگزین میں چھپوانے کے لیے لیے جائے۔

قمر میں مان لیتا ہوں تمھارے اندر بے پناہ اوصاف ہیں۔ لیکن مجھے کہنے کی اجازت دینا کہ تم مردم شناس بالکل بھی نہیں۔ تم اپنی مرضی سے ہمیشہ گدھوں میں گھرے رہے ہو۔

ان دنوں سہیل ثاقب کے ہاں اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم کے باقاعدگی سے اجلاس ہوتے تھے۔ جس کا روح رواں قمر تھا۔ سہیل نے جس فراخدلی اور کشادہ پیشانی سے میزبانی کی کوئی دوسرا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔

اجلاس کا پہلا حصہ نثری اور دوسرا شعری ہوتا۔ اقبال فرید میسوری، شعیب نگرامی، طارق بٹ، زین صدیقی، محمود شاہد، پرویز اختر، سعید منتظر، طارق اقبال اور ناز مظفر آبادی جیسے سینئرز کی موجودگی میں نوآموزوں کے لیے بہت کچھ سیکھنے کا سامان موجود ہوتا۔ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی۔ پروگرام کے آخر میں اس دوران غلط ادا ہونے والے الفاظ کے درست تلفظ کی نشاندہی کی جاتی۔ ہر ماہ پروگرام ایک خاص ڈگر سے ہو رہا تھا۔ میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ میں قمر کو بار بار مختلف تجاویز دینے لگا۔ ایک دن وہ تنگ آ جاتا ہے۔

”سعید بھائی! اصل میں یہ تنظیم سہیل کی ہے۔ خرچ بھی وہی کرتا ہے۔ اس لیے سب کچھ اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔“

میں نے اپنے تحفظات محمود شاہد کے سامنے رکھے۔ اس نے دوٹوک کہا۔

”دیکھیں اگر آپ کو ان کا طریقہ کار نہیں پسند تو پروگرامز میں مت جائیں۔“

اور میں اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم کے پروگرامز میں جانا بند کر دیتا ہوں۔ البتہ انفرادی سطح پر کسی سے تعلق ختم نہیں کیے۔

دو ہزار آٹھ میں میرا پہلا شعری مجموعہ چھپ کر آیا۔ ناز مظفر آبادی، فرح جعفری اور ایوب صابر نے بزم شعر و سخن کے بینر تلے اس کی تقریب رونمائی کا فیصلہ کیا۔ اس تقریب کی وجہ سے بہت سارے معاملات واضح ہو کر سامنے آئے۔ جن میں سے بیشتر

ناگفتنی ہیں۔ حسین سحر (مرحوم) کی صدارت تھی۔ وہ آخری وقت بغیر اطلاع کے غیر حاضر ہو گئے۔

اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم اور بزم شعرو سخن دونوں تنظیمیں اس وقت ایک دوسرے کے آمنے سامنے صف آرا تھیں۔ قمر نے اپنے دوستوں کے سامنے یہ موقف رکھا۔ ہم نے کسی کی طرف نہیں دیکھنا۔ ہم سعید اشعر کی وجہ سے اس پروگرام میں جائیں گے۔ قمر نے مجھ پر لکھا ہوا خاکہ بھی پڑھا۔ پروگرام سے ایک دن پہلے سجاد سلیم اور طارق محمود کافی دیر تک میرے پاس موجود رہے۔ وہ پروگرام میں نہیں آئے۔ شوکت جمال نے اس پروگرام کی صدارت کی۔ قمر کے اس دانشمندانہ قدم کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کے بعد دونوں تنظیموں نے ایک دوسرے کے ساتھ کھلے دل سے تعاون کرنا شروع کر دیا۔

میں تمام تنظیموں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہوں۔ کم از کم ریاض، منطقہ شرقیہ دمام اور بحرین کی حد تک یہ تنظیمیں بارٹر سسٹم کے ماتحت چلنے والی دکانیں تھیں۔ کھرا سکہ رائج نہیں تھا۔ یہاں اجناس کا تبادلہ ہوتا تھا۔ دمام کی تنظیمیں جبیل، بحرین، الحسا اور ریاض کی تنظیموں کے عہدے داروں اور کرتے دھرتوں کو سٹیج پر نمایاں جگہوں پر بٹھاتیں۔ اسی طرح باقی جگہوں کی تنظیمیں بھی جواباً یہی کچھ کرتیں۔ اسی طرح یہاں ڈاکٹر شعیب نگرامی کے علم کے بجائے قاضی یونس کی دولت زیادہ باثر رہی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مال کے ساتھ ساتھ کچھ نسوانی صورتیں بھی اپنا ہنر آزمانے لگیں۔

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ناز مظفر آبادی اور فرح جعفری کو کسی معاملے میں جیل ہو جاتی ہے۔ سزا مکمل ہونے کے بعد دونوں ڈی پورٹ کر دیے گئے۔ بزم شعرو سخن اپنے انجام کو پہنچی۔ قمر اور سہیل کا اختلاف ہو گیا۔ اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم اس حال میں منتقل ہو گئی جہاں کبھی میری اور قمر کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس دوران قدسیہ ندیم لالی ایک سپر پاور بن کر ابھری۔ اب ایوب صابر کی نظامت میں اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم کے اجلاس ہونے لگے۔ یوں سمجھیں ایوب صابر نے مردے میں دوبارہ جان ڈال دی۔ اس نے مجھے بھی اکسایا اور مراقبے سے باہر نکالا۔ میں بھی فورم کے پروگرامز میں شریک ہونے لگا۔ قمر باقاعدگی سے بکرے کے پائے بنواتا۔ ایک بار میں اور لالی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں ایک پائے سے گوشت توڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ ربڑ کی طرح میرے ہاتھ سے چھوٹتا ہے اور لالی کی گود میں جا گرتا ہے۔ لالی اسے چپکے سے اپنے پرس میں رکھ لیتی ہے۔ اور بڑے مزے سے کہا۔

""سعید صاحب! پائے کا اصل مزہ تو اس کے شوربے میں ہے۔""

پروگرام کے دوسرے دن مجھے لالی کی کال آئی۔

''آؤ قمر کے ہاں چلتے ہیں۔''

میں نے وجہ پوچھی۔

''اپنے کھانے کے لیے آج اس نے پائے گلا لیے ہوں گے۔''

اسی طرح ایک اور فنکشن میں لالی اور میں ساتھ ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ سعید مختطر ہمارے سامنے بیٹھے تھے۔ لالی نے میری پلیٹ میں پائے کا سالن ڈالا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک نے دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔

''قمر کو پتہ ہے اس بڈھے کے دانت نہیں۔ آج پائے کیسے مزے کے گلے ہوئے ہیں۔''

پھر یوں ہونے لگا میرا یا لالی کا جب بھی پایا کھانے کو موڈ کرتا قمر کو کال کرتے۔

''یار کافی دنوں سے کوئی فنکشن نہیں ہوا''

اگلی جمعرات کو قمر کے ہاں اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم کا اجلاس منعقد ہو جاتا۔ ہم پانچ سات اکٹھے ہو جاتے۔ دو دن بعد اُردو اخبار کا آدھا ادبی صفحہ اس پروگرام کی با تصویر رپورٹنگ سے بھرا ہوتا۔ پروگرام کے بعد اکثر لالی مجھے کہتی۔

''سعید صاحب! آپ نکلیں۔ مجھے قمر کی بیگم سے کچھ کام ہے۔''

اتفاق سے ایک دن میں اپنا موبائل قمر کی میز پر چھوڑ آیا۔ واپس جاتا ہوں۔ لالی دروازے سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا شاپر تھا جو آتے وقت نہیں تھا۔ ندیم بھائی کو بھی پائے بہت پسند ہیں۔

پائے کے معاملے میں قمر کو اختصاص حاصل ہے۔ اتفاق سے ایک بار بقر عید پر میں اور قمر بکرا منڈی ایک ساتھ گئے۔ ایک میلے کا سماں تھا۔ ہر خریدار بکرے کا منہ کھول کھول کر اس کے دوندا ہونے کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں قمر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اپنے پسندیدہ بکرے کے پائے چیک کر رہا تھا۔

فرید بھٹہ کی کتاب کی رونمائی تھی۔ لالہ ریاض خادم نے بار بار اصرار کیا۔ اب ایسے پیارا آدمی کی بات کون رو کر سکتا تھا۔ میں اور قمر ساڑھے چار سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے ریاض پہنچ گئے۔ جب تک پروگرام شروع نہیں ہوا۔ میں اور ریاض خادم ساتھ ساتھ رہے۔ خوب باتیں کرتے رہے۔ پروگرام شروع ہوا۔ ہم دونوں خوب خوش گپیاں کر رہے تھے - پروگرام کا دوسرا دور جو مشاعرے پر مشتمل تھا اس کا آغاز ہوا۔ سٹیج پر اقبال قمر کے ساتھ سرفراز ضیا اور ڈاکٹر عابد جیسے مشاہیر رونق افروز تھے۔ شاہد خیالوی نظامت کر رہا تھا۔ اس نے دوسرے نمبر پر میرا نام پکارا۔ ہال پر سناٹا چھا گیا۔ اقبال قمر چیخ اُٹھا۔

''یار! اتنے سینئر شاعر کا کچھ تو خیال کیا ہوتا۔''

میں دو شعر پڑھ کر سٹیج سے اُتر آیا۔ ریاض

خادم پر نظر ڈالی وہ اپنے جوتے دیکھ رہا تھا۔ فرید بھٹہ میرے پاس آئے۔ میری ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر معذرت کی اور کچھ دنوں بعد فیس بک پر مجھے ان فرینڈ بھی کر دیا۔ پروگرام جاری رہا۔ ریاض خادم اس دوران ایک لفظ نہیں بولا۔ اس کی نظریں مسلسل مجھ سے دور بھاگنے کی کوشش میں مصروف رہیں۔ پروگرام ختم ہوا۔ میں نے خادم کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی سیٹ پر نہیں تھا۔ اس کے بعد آج تک میرا خادم سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔ قمر نے اس واقعہ کو دل پر لیا۔ میری دلجوئی اور اشک شوئی کے لیے اس کے بعد دمام میں ہونے والے اکثر پروگرامز میں میری شمولیت صدر محفل یا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ہونے لگی۔ میری صدارت میں ایک فنکشن ایسا بھی ہوا جس میں فرحت پروین نے اپنا افسانہ تنقید کے لیے پیش کیا۔ اس دوران دو تین بار شاہد خیالوی دمام آیا۔ میں نے اس سے بات چیت کی اور اس کی سیلفیاں لیں۔ کچھ دنوں بعد میری لاٹری نکلی۔ پاکستان ایمبیسی ریاض کے ایک فنکشن کی صدارت میرے حصہ میں آ گئی۔ شاہد خیالوی بھی وہیں تھا۔ پروگرام ختم ہوا سب ایک دوسرے سے ملے۔ شاہد خیالوی مجھ سے نہیں ملا۔ خادم کو مسلسل میری آنکھیں تلاش کرتی رہیں۔ وہ اس پروگرام میں بھی نہیں تھا۔ یوسف علی یوسف کا شکریہ ادا کرنا ابھی تک باقی ہے۔

ارشد معراج کی دیکھا دیکھی مجھے بھی شوق چرایا۔ ایسی نظمیں لکھوں جن کے کچھ حصے سمجھ آئیں اور کچھ سر کے اوپر ہی اوپر سے گزر جائیں۔ سلسلہ چل نکلا۔ اچھی خاصی نظمیں اکٹھی ہو گئیں مسودہ تیار ہو گیا قمر کو دیا تھا کہ ایک نظر دیکھ لے۔ اب اسے فرصت نہیں مل رہی۔ کافی دنوں کے بعد طے ہوا۔ آنے والے جمعہ کے دن اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے ہیں جمعہ کو میں پہنچ جاتا ہوں خوب گپ شپ ہوئی۔ ہم نے کھانا کھایا۔ قمر کام کی بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں چڑ ہو گیا۔

”یار! ناراض نہ ہونا مسودہ نہیں مل رہا۔ یہیں رکھا تھا۔“

”بیڑہ غرق“

میں سمجھ گیا۔ مروت میں انکار نہیں کر سکتا۔ بہانہ تراش رہا ہے۔ واپس آ گیا۔ یاد آیا مسودے کی فوٹو کاپی بھی کی تھی۔ ہفتہ بھر کی تلاش کے بعد ای میل پر مل گیا پرنٹ کیا اور دو ہفتوں کے بعد دوبارہ قمر اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

میری داڑھی بڑھتے بڑھتے ناف تک پہنچ گئی۔ ایک دن قمر کی کال آئی۔

”کل لازمی آنا ضروری کام ہے۔“

”قمر بھائی! میں نہیں آ سکتا۔ مجھے کمپنی کے ایک کام سے کہیں جانا ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ آفس میں کوئی عذر پیش کرو۔“

اگلے دن میں شام کے وقت قمر کے گھر پہنچ

گیا- تھوڑی دیر بعد اس کے بیٹے جبران نے میز پر قورمہ، حلوہ اور روٹی لا کر رکھ دی- میں نے اسے کہا- "ابھی مجھے بھوک نہیں اچھا ہوتا تھوڑی دیر بعد لاتے- ویسے اس تکلف کی ضرورت نہیں تھی-"

اس سے پہلے کہ میں نوالہ توڑتا- قمر جھٹ سے بولا-

"یہ تمھارے لیے نہیں - آج ہمارے بزرگوں کی دعا ہے- بیگم نے کہا ہے سعید صاحب کو بلوا کر دعا کرا لیں-"

میں نے ہاتھ بلند کیے- باقاعدہ پروفیشنل انداز میں دعا کرنے لگا- قمر کو معلوم نہیں تھا کہ میں کچھ عرصہ ایک مسجد کا پیش امام بھی رہا ہوں- قمر تو خاموشی سے میرا منہ دیکھتا رہا البتہ دروازے کے پیچھے سے ناک صاف کرنے کی آواز آئی- شاید قمر کی بیگم رو رہی تھی-

بچپن میں کسی کے دماغ میں اگر کوئی ڈر بیٹھ جائے وہ کسی صورت نہیں جاتا- ماہرِ نفسیات چاہے جتنی تحلیلِ نفسی کر لیں- مریض کی اپنی ہی ایک منطق ہوتی ہے- قمر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے- ابتدائی دنوں میں جب نئی غزل کہتا- دوسرے دن ڈاکٹر عاصم اس زمین میں دو غزلہ سنا دیتا- ڈاکٹر عاصم تو چلا گیا لیکن قمر کے اندر بیٹھا ہوا ڈر نہیں گیا- سارا دن فیس بک پر نظر رکھتا ہے- اس کے باوجود وہ کوئی شعر یا غزل پوسٹ نہیں کرتا- دیکھتا رہتا ہے کہ کسی نے اس کی کوئی ترکیب یا کوئی علامت تو نہیں اڑا لی- کہیں کوئی غزل تو اس کی زمین میں موجود نہیں- اپنی ڈی پی پر بھی اپنا کوئی شعر دیکھ لے تو اسے ایک جھٹکا لگتا ہے- اس مسلسل ٹینشن نے اسے باقاعدہ شوگر کا مریض بنا دیا ہے- جس دن شوگر بڑھ جائے جاگتے میں بھی ڈاکٹر عاصم کا بھوت اسے نظر آتا ہے- ایک دن اچانک قمر نے فیصلہ کیا اور واپس چلا گیا میں اسے ملنے جہلم پہنچ گیا- کیسے کیسے پیارے لوگوں میں دولہا بنا بیٹھا تھا- اس کے صدقے میری بھی سید انصر، اقبال ناظر، شہزاد قمر اور صدیق سورج جیسے لاجواب شاعروں سے ملاقات ہوئی قمر پر یہ تحریر لکھنے سے پہلے اس پر لکھا ہوا میں ایک خاکہ گم کر چکا ہوں- یاد آیا ہم آواز میں قمر کی الوداعی تقریب میں اس پر میں نے ایک سنجیدہ مضمون بھی پڑھا تھا- اسے کال کی-

"یار وہ آپ پر ایک سنجیدہ مضمون پڑھا تھا- وہ آپ نے رکھ لیا تھا- میرے پاس اس کی کاپی نہیں- عنایت کریں تو اس میں ذرا سا ادل بدل کر کے آپ کا خاکہ بنا لوں ایک خاکہ لکھا تھا وہ گم ہو گیا ہے-"

"یار تمھیں اپنے خاکے کی پڑی ہے- مجھے اپنے دوسرے شعری مجموعے کا مسودہ نہیں مل رہا- پتہ نہیں کہاں گم کر بیٹھا ہوں-"

بے اختیار میرے منہ سے نکلا-

"بیڑہ غرق-"

اس دوران میں اور قمر نے مختلف مشاعروں میں اکٹھا جانا شروع کر دیا۔ خاص کر ان مشاعروں میں ضرور ساتھ چلتے جو متنازع ہوتے تاکہ بعد میں ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرا سکیں۔ قمر مشاعرے سے ایک دن پہلے اپنی تازہ غزل مجھے سناتا۔ رستے میں اس غزل کے مختلف شعروں پر بات کرتا۔ کوئی مصرع ذرا سا بھی چبھتا تو اکے آٹھ آٹھ متبادل مصرعے لے آتا۔ اس کی غزل میں کبھی کوئی بھرتی کا شعر یا مصرع نظر نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ سات اشعار کی غزل کہتا ہے جو دوسروں کی سات غزلوں پر بھاری ہوتی ہے۔ سستی شہرت کے لیے اس نے کبھی چیختے چنگاڑتے سطحی شعر نہیں کہے۔

میں نے یہاں اپنے بیس سالہ قیام کے دوران دو واضح ادبی ادوار دیکھے ہیں۔ پہلا دور اقبال فرید میسوری، محمود شاہد، زین صدیقی، پرویز اختر اور اقبال قمر جیسے ادبا و شعرا کا تھا۔ ایک ایک کر کے یہ لوگ گھٹتے چلے گئے اس دوران دوسرا دور آغاز کرتا ہے اور اپنا پھیلاؤ بڑھاتا چلا جاتا۔ اب منفرد، ممتاز، معروف، صاحب اسلوب، عہد ساز اور عالمی شہرت یافتہ جیسے ادبا و شعرا کی ہر طرف بہار ہے۔ کمال اس وقت ہوتا ہے جب یہ سب قمر کو اپنا استاد کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

پھر قمر نے عجیب کام پکڑ لیا۔ اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم کے ہر پروگرام کی صدارت فرمانا شروع کر دی۔ پانچ سات پروگراموں تک صرف چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ایک دن لاوا پھٹ پڑی۔ قمر نے اگلے پروگرام کی صدارت نہیں کی۔ اب وہ اپنی ہی تاحیات صدارت میں چلنے والی تنظیم کے ایک ایسے پروگرام میں مہمانِ خصوصی کی سیٹ پر سہرا باندھ کر بیٹھ گیا جس کا میزبان بھی وہ خود تھا۔ میری برداشت بھی جواب دے گئی۔ کیا دیکھتے ہیں اگلے پروگرام میں ایوب صابر نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے کچھ کاغذ قمر کے حوالے کیے۔ ایوب صابر کو ادراک ہو چکا تھا کہ اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم میں اس کا مزید رکنا سودمند نہیں۔ جلد ہی اس نے بزم ادراک کے قیام کا اعلان کر دیا۔ قمر کے ہاں ہم نے آخری بار پائے تناول کیے۔ اگلے مہینے بزم ادراک کے ماتحت ہونے والے پروگرام میں سب ایک بہت بڑی میز کے گرد بیٹھے گرین ٹی کے ساتھ فرنچ فرائز اور سینڈوچ کھاتے ہوئے سیلفیاں لینے میں مصروف تھے۔ رات گئی بات گئی۔

”قمر تم نے بہت اچھا کیا جو یہاں سے وقت پر نکل گئے۔ فلم ”لائن کنگ“ یاد آ رہی ہے۔ جس میں ایک شیر لگڑبگوں میں گھر جاتا ہے۔ دعا کرو میں بھی خیریت سے واپس آ جاؤں۔“

☆☆☆☆☆

غزل اور نظم کا تقابلی جائزہ: فکری، فنی اور ابلاغی پہلو

شاعری محض لفظوں کا حسین امتزاج نہیں بل کہ احساس کی وہ تجسیم ہے جس کے ذریعے انسان اپنے باطن کی گہرائیوں کو کائنات کے لاشعور سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ وہ لطیف زبان ہے جس میں جذبہ معنی بن کر بہتا ہے اور معنی جذبے میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اگر دو صنفیں مرکزِ اظہار بنی ہیں تو وہ غزل اور نظم ہیں؛ دونوں اپنی اپنی جہت میں آئینۂ احساس بھی ہیں اور مظہرِ فکر بھی۔ غزل صدیوں کی تہذیبی روایت کا حاصل ہے، جس میں انسانی جذبات، عشق و محرومی، درد و سوز، اور لطافتِ احساس کا بیان ایک خاص فنی دائرے میں رہ کر کیا گیا۔ یہ صنف فارسی تغزل کے زیرِ اثر برصغیر میں اس طرح جڑ پکڑ چکی کہ اردو تہذیب کی روح بن گئی۔ ہر گھر، ہر محفل، ہر زمانہ غزل کے کسی نہ کسی مصرعے سے وابستہ رہا۔ مگر وقت کا پہیہ رکا نہیں - عہدِ حاضر نے اظہار کے پیمانے بدل دیے، مفاہیم کی وسعت نے نئی ساختیں مانگیں، اور انسان کے ذہنی کرب نے شاعری سے زیادہ شفاف، مربوط اور فکری اظہار چاہا۔ یہاں نظم ایک ایسے وسیع تر ابلاغی سانچے کے طور پر سامنے آئی جس نے جذبے کو فکر کے ساتھ اور فرد کو سماج کے ساتھ جوڑا۔ نظم نے انسان کے شعورِ عصری، فلسفیانہ سوالات، اور تہذیبی بحرانوں کو ایک وحدتِ تاثر میں سمیٹنے کا عمل ممکن بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری میں نظم کو وہ مقام حاصل ہوا جسے ہم بیٹر کمیونیکیشن یا بہتر ابلاغ کہہ سکتے ہیں۔

تاہم اس کے ساتھ غزل کی روحانی، جمالیاتی اور لسانی عظمت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ غزل اردو شاعری کی نس نس میں

ابرار عمر

رہی ہے۔ یہ صنف اگرچہ مختصر پیمانے پر احساسات کو پیش کرتی ہے مگر اسی اختصار میں معنویت کا جہان سمیٹ لیتی ہے۔ فارسی میں حافظ، رومی اور بیدل کی غزلیں عرفان و سلوک کا آئینہ ہیں، تو اردو میں میر، غالب، اقبال اور فیض نے اسی صنف کو انسانی دکھ اور اجتماعی شعور کی صدا بنا دیا۔ لیکن وقت کے ساتھ غزل کی یہ صدا کہیں کہیں داخلی تکرار میں گم ہونے لگی۔ جدید ذہن کو اب ایسے قالب کی ضرورت تھی جو صرف حسنِ بیان نہیں بل کہ نظامِ فکر بھی پیش کرے۔ نظم نے یہی ذمہ داری سنبھالی۔

نظم کا کینوس وسیع ہے۔ وہ ایک مصرعے کے اشارے سے نہیں بل کہ ایک فکری تسلسل سے قاری کے ذہن پر اثر ڈالتی ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک خود مختار جزیرہ ہے جب کہ نظم ایک مربوط قارتا ہے جو قاری کو ابتدا سے اختتام تک باندھے رکھتی ہے۔ یہی وحدت تاثر جدید ذہن کی ترجمان ہے، کیونکہ موجودہ دنیا میں ابلاغ جزوِ اعظم بن چکا ہے۔ لہٰذا نظم اپنی ساخت اور فکری گہرائی کے باعث بین الاقوامی سطح پر بھی زیادہ قابلِ فہم اور موثر اظہار بن کر ابھری۔ دوسری طرف غزل اپنے تغزل، رمزیت اور اختصار کے باعث کبھی کبھی ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، خاص طور پر وہاں جہاں ذہن فلسفے اور منطق کی سطح پر گفتگو چاہتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ غزل ہماری ثقافتی روح ہے اور نظم ہمارا فکری وجود۔ غزل جذبے کی لطافت رکھتی ہے تو نظم فکر کی قوت۔ دونوں اپنی اپنی جگہ معتبر ہیں، مگر ابلاغ، تجزیہ اور بین الاقوامی تفہیم کے دور میں نظم ایک زیادہ موثر اور پائیدار وسیلہ بن گئی ہے۔ یہ شاعری کو صرف احساس کے حصار سے نکال کر شعور کی وسعتوں میں لے جاتی ہے، اور یہی اسے عہدِ جدید کی سچی نمائندہ صنف بناتا ہے۔

غزل اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس نے ہمارے اجتماعی شعور اور انفرادی احساس دونوں کو یکساں گہرائی سے متاثر کیا۔ اس کی جڑیں عربی قصیدہ اور فارسی تغزل سے پھوٹتی ہیں، مگر برصغیر میں آ کر اس نے ایک نئی روح، نیا لہجہ اور نیا تجربہ حاصل کیا۔ عربی شاعری میں جہاں قصیدہ قبائل کی شان، مدح یا فخر کے بیان کا وسیلہ تھا، وہاں فارسی میں تغزل نے انسانی باطن کے اسرار کو آشکار کرنے کا کام کیا۔ فارسی غزل نے عشق کو محض جذباتی کیفیت نہیں بل کہ روحانی سفر کی علامت بنا دیا۔ حافظ و رومی کے ہاں محبوب صرف حسنِ ازل کا استعارہ نہیں بل کہ

معرفت کے اسرار تک پہنچنے کا دروازہ ہے۔ سعدی کی غزل اخلاقی بصیرت رکھتی ہے اور بیدل کے ہاں غزل کائناتی الجھنوں کا رمز بن جاتی ہے۔ یہی وہ روحانی وفکری وراثت تھی جس نے اردو غزل کو ایک مخصوص تہذیبی شعور عطا کیا۔

برصغیر کی فضا میں جب فارسی کا یہ تغزل اردو کے لسانی سانچے میں داخل ہوا تو اس نے ایک نئے رنگ میں جنم لیا۔ میر تقی میر نے اس کو انسان کے اندر کے کرب، تنہائی، محرومی اور شکستگی کا آئینہ بنایا۔ میر کے ہاں عشق صرف محبوب تک محدود نہیں رہتا، بل کہ یہ انسان کے وجودی اضطراب کی کہانی بن جاتا ہے۔ غالب کے ہاں یہی غزل عقل، شک اور شعورِ نفس کی سطح پر پہنچ جاتی ہے ۔وہ عشق کو ایک فلسفیانہ معمہ بنا دیتے ہیں اور انسان کے باطن میں جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح اردو غزل نے عشق کی روایتی تنگی سے نکل کر ذہن اور روح کے سفر کی وسعت اختیار کر لی۔

غزل کی فنی ساخت بھی اس کے معنوی حسن کا حصہ ہے۔ اس میں ردیف اور قافیہ کی تکرار ایک موسیقیت پیدا کرتی ہے، جو دل پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ بحر کا انتخاب، الفاظ کی چمک، تراکیب کی چستی اور استعاراتی نظام، سب مل کر غزل کو ایک لطیف جمالی تجربہ بناتے ہیں۔ ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل کائنات ہے، ایک الگ مفہوم رکھتا ہے، لیکن غزل کا جادو یہ ہے کہ یہ بکھرے ہوئے اجزا کو بھی ایک وحدت احساس میں بدل دیتی ہے۔

اردو تہذیب میں غزل کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کا سماجی کردار بھی ہے۔ یہ عوام اور خواص دونوں کی زبان بنی۔ مشاعروں کی محفلوں میں غزل نے سامعین کے دلوں پر جو جادو کیا وہ کسی اور صنف کے حصے میں نہ آیا۔ ایک عام آدمی بھی اگر شاعر بننا چاہے تو سب سے پہلے غزل ہی اس کے لبوں پر آتی ہے۔ غزل کی یہی مقبولیت اس کی داخلی نغمگی، مختصر اظہار، اور زبان کے حسنِ ادا کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن اسی مقبولیت نے کہیں کہیں اس کو سطحی پن کا شکار بھی کیا۔ ہر شخص نے غزل کہنا شروع کیا مگر ہر غزل گو شاعر نہیں بن سکا۔

اس کے باوجود غزل کی روایت ایک زندہ روایت ہے۔ اس میں تغزل کی لطافت، بیان کی تہذیب، اور احساس کی نرمی وہ عناصر ہیں جنھوں نے اردو زبان کو ایک خاص وقار عطا کیا۔ یہ روایت ہمارے اجتماعی مزاج کا

حصہ بن چکی ہے۔ ہماری محفلوں، خطابات، فلمی گیتوں اور روزمرہ گفتگو تک میں غزل کے اشعار بسے ہوئے ہیں۔ اس کا ہر مصرع ہماری ثقافت کا نشان ہے۔

یوں غزل صرف شاعری کی صنف نہیں بل کہ اردو تہذیب کا شعری ضمیر ہے۔ اس نے ہمارے شعور کو نغمگی بخشی، ہمارے احساسات کو شائستگی دی، اور ہمارے اظہار کو رمزیت کا ہنر سکھایا، مگر وقت کے تغیر کے ساتھ ساتھ جب انسان کی فکری دنیا وسیع ہوئی، جب زندگی کے مسائل زیادہ پیچیدہ ہوئے، تو غزل کے مختصر پیمانے اور رمزیاتی اسلوب میں ان سب کا احاطہ ممکن نہ رہا۔ یہاں سے نظم کا دور شروع ہوا، جس نے فکر اور ابلاغ کے نئے در وا کیے۔

فارسی شاعری میں غزل محض عشق و حسن کی داستان نہیں بل کہ ایک مابعدالطبیعیاتی تجربہ ہے، جہاں محبوب کا چہرہ وجود کے اسرار کا آئینہ بن جاتا ہے۔ عربی شعری روایت میں اگر فخر، مدح اور حماسی رنگ غالب تھے تو فارسی غزل نے انسان کو کائنات کے مرکز کے طور پر دیکھنے کی جرأت دی۔ اس نے عشق کو عقل پر فوقیت دی اور جمال کو حقیقت تک رسائی کا وسیلہ بنایا۔ یہی وہ جمالیاتی عرفان تھا جس نے فارسی غزل کو ایک فکری و روحانی روایت کی صورت دے دی۔ حافظ، سعدی، مولانا روم، بیدل، عراقی اور جامی جیسے شعرا نے اس تغزل کو تصوف کی راہوں سے گزار کر ایک ایسی دنیا خلق کی جہاں لفظ، معنی اور وجدان ایک ہو جاتے ہیں۔

حافظ شیرازی کی غزل میں بیک وقت عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کی رمزیت کارفرما ہے۔ ان کے محبوب کے لب اگرچہ انگور کے رس سے رنگین ہیں مگر دراصل وہ حقیقتِ ازلی کے جلوے ہیں۔ وہ کہتا ہے ''درازل پرتوِ حسنت زتجلی دم زد'' یعنی آغازِ آفرینش ہی سے حسنِ مطلق کی تجلی نے وجود کو معنی بخشا۔ یہاں عشق ایک عرفانی سفر ہے جو انسان کو اپنے خالق تک پہنچاتا ہے۔ حافظ کی غزل میں یہ روحانی کیفیت ایک وجدانی ابلاغ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس میں قاری خود اپنے باطن کے آئینے میں جھانکنے لگتا ہے۔

مولانا روم نے غزل کو عشقِ الٰہی کی صدا بنایا۔ ان کے نزدیک غزل وہ بانگ ہے جو روح کے اندر سوزِ کائنات کو جگاتی ہے۔ ان کے اشعار میں الفاظ نہیں جلتے، بل کہ شعلہ بن کر روشن کرتے ہیں۔ وہ عشق کو وہ آگ قرار دیتے ہیں جو دل کو پاک کر کے حقیقت کی

طرف لے جاتی ہے۔ اسی لیے ان کی غزل میں سماع اور حرکت کی فضا قائم رہتی ہے — گویا ہر لفظ رقص میں ہے، ہر مصرعہ مراقبے کی کیفیت میں۔

سعدی کی غزل اخلاق اور حکمت کی لطافت رکھتی ہے۔ ان کے ہاں تغزل صرف عاشقانہ اظہار نہیں بل کہ انسانی تجربے کی دانائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عشق انسان کو نرم دل بناتا ہے اور محبت اخلاقی شعور پیدا کرتی ہے۔ ان کے نزدیک حسن اگر روحانی بصیرت سے خالی ہو تو محض غفلت ہے۔ بیدل دہلوی نے اس روایت کو مزید پیچیدہ فکری سطح پر پہنچایا۔ ان کی غزل میں معنی کی تہہ در تہہ کائنات بستی ہے۔ بیدل کے یہاں عشق، شعورِ ذات اور فلسفۂ وجود ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں تصوف کا عرفانی جلال اور زبان کا لسانی کمال ایک ساتھ جلوہ گر ہے۔

فارسی غزل نے یوں تغزل کو ماورائیت کے دائرے میں داخل کر دیا۔ اس نے لفظ کو استعارہ اور استعارے کو فلسفہ بنا دیا۔ اس کے نتیجے میں غزل محض جذبات کی نہیں بل کہ بصیرت کی زبان بن گئی۔ محبوب کی زلف وجود کی پیچیدگی ہے، اس کی آنکھ ازل کی روشنی، اور اس کا ہجر کائنات کی فکری تنہائی۔ فارسی غزل نے انسان کو اپنے باطن کے سفر پر بھیجا، جہاں عشق، عقل پر غالب آ کر وجدان کو حقیقت کا آلہ بنا دیتا ہے۔

یہی عرفانی و فکری وراثت بعد میں اردو غزل میں منتقل ہوئی۔ میر اور غالب نے اسی روایت سے فیض پایا۔ لیکن جہاں فارسی غزل کا محبوب ماورائی اور مجرد ہے، وہاں اردو غزل کا محبوب زمین پر اُتر کر انسانی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فارسی غزل نے اگر روح کو پکارا تو اردو غزل نے دل سے گفتگو کی۔ دونوں کی راہیں الگ ہیں مگر جڑ ایک ہی ہے یعنی عشق بطور تخلیقی قوت۔

اس طرح فارسی غزل نے اردو غزل کے لیے فکری بنیاد فراہم کی، جس پر ہماری پوری شعری روایت قائم ہے۔ اس نے تغزل کو گہرائی بخشی، احساس کو وجدان میں بدلا، اور شاعری کو صوفیانہ ترفع عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں جب بھی عشق، حسن یا روح کی بات آتی ہے تو اس کے پیچھے فارسی غزل کی روح بولتی سنائی دیتی ہے۔

برصغیر کی سرزمین وہ مرکز رہی ہے جہاں فارسی تغزل نے جب اردو کے سانچے میں حلول کیا تو اس نے ایک نیا لہجہ، نئی فضا اور ایک جداگانہ احساس پیدا کیا۔ یہاں غزل

محض عشق و عاشقی کی صنف نہ رہی بل کہ انسان کے باطنی المیے، اجتماعی احساس اور تہذیبی شعور کی زبانی ترجمان بن گئی۔ اردو غزل نے نہ صرف اپنے اظہار میں زبان کی لطافت اور بیان کی تہذیب کو سمیٹا بل کہ اسے ایک ایسی ثقافتی شناخت بخشی جو پورے برصغیر کے روحانی اور سماجی نظام میں رچ بس گئی۔ میر تقی میر کے ہاں غزل کا لہجہ سراپا دردمندی کا ہے۔ ان کے اشعار میں عاشقانہ واردات دراصل انسان کے اندر کے زخموں کی صدا بن جاتی ہے۔ میر کی غزل میں محبت، غم، تنہائی اور فنا کا تصور ایک ایسے لطیف تغزل میں تحلیل ہو جاتا ہے جو انسان کے وجودی دکھ کا استعارہ بن جاتا ہے۔ وہ عشق کو محض لذت یا تجربہ نہیں بل کہ انسانی شعور کی ایک بنیادی حرکت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

غالب کے ہاں آ کر غزل نے ایک فکری موڑ لیا۔ انھوں نے عشق کو عقل اور شعور کے آئینے میں دیکھا، اور انسان کو اس کے وجودی تضادوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ان کے ہاں غزل کا محبوب محض حسن کا پیکر نہیں بل کہ ایک فلسفیانہ سوال بن جاتا ہے۔ غالب نے غزل کے روایتی سانچے میں فکر کی گہرائی داخل کی اور شاعری کو استدلال کے مرتبے تک پہنچایا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب غزل ایک جمالی تجربے سے نکل کر ایک فکری واردات بن گئی۔ اس کے بعد علامہ اقبال آئے جنھوں نے غزل کو ایک بالکل نئی معنویت عطا کی۔ ان کے ہاں عشق محض احساس نہیں بل کہ ایک تخلیقی توانائی ہے جو فرد کو جمود سے نکال کر عمل کی راہ دکھاتی ہے۔ اقبال کی غزل نے انسان کو خودی کی آگہی دی، روحانی قوت بخشی اور اس کو کائنات کے تخلیقی نظام کا شریکِ کار بنایا۔

فیض احمد فیض نے غزل کے اس تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے اس میں اجتماعی دکھ، سیاسی شعور اور سماجی بغاوت کے رنگ بھرے۔ ان کے ہاں محبوب اب محض فرد نہیں رہا بل کہ ایک علامت ہے، جو ظلم کے نظام کے خلاف انسانی جدوجہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ فیض کی غزل میں عشق اور انقلاب کا امتزاج ایسا ہے کہ ہر مصرع ایک اجتماعی ضمیر کی گواہی دیتا ہے۔ ان کے بعد ناصر کاظمی اور احمد ندیم قاسمی جیسے شعرا نے غزل کو داخلی تنہائی، گمشدگی، اور جدید انسان کے وجودی کرب کا اظہار بنایا۔ ناصر کی غزل میں سناٹے بولتے ہیں، خالی پن کا حسن ہے، اور ایک ایسا لطیف دکھ جو جدید عہد کی روحانی بے سمتی کو ظاہر کرتا ہے۔

فیض کے بعد اردو غزل نے جس نئے شعور، نرمی اور عصری احساس کی صورت اختیار کی، اس کے نمایاں نمائندے احمد فراز ہیں۔ فراز نے غزل کو ایک شائستہ مگر پُر اثر لہجہ دیا۔ ان کے ہاں رومان کی لطافت میں احتجاج کی آنچ بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری میں محبت ایک ذاتی واردات نہیں بل کہ اجتماعی حسیت کی علامت بن جاتی ہے۔ وہ غزل کی موسیقیت اور زبان کی تہذیب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں عہد کے سیاسی اور نفسیاتی کرب کو شامل کرتے ہیں۔ فراز کی غزل میں حسنِ اظہار اور دردِ دل دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے؛ وہ عشق کی شکستگی میں بھی وقار قائم رکھتے ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد فراز کلاسی کی غزل کا نقطہ انجام ہے

شکیب جلالی نے غزل کو داخلی گہرائی، سوز باطن اور المیہ شعور بخشا۔ ان کے ہاں احساس کی شدت ایک نفسیاتی تجربے کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ شکیب کے اشعار میں ہجر، خودکلامی اور وجودی بے سمتی ایک لطیف نغمگی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کا تخیل زمینی بھی ہے اور ماورائی بھی۔ ان کی غزل میں ایک دردناک خاموشی ہے جو قاری کے دل میں اتر کر دیر پا اثر چھوڑتی ہے۔ شکیب جلالی کے ہاں تغزل، گہرائی، اور علامتی نظام اس درجے میں ہم آہنگ ہیں کہ ہر شعر ایک مکمل داخلی دنیا معلوم ہوتا ہے۔

منیر نیازی کی غزل اپنی نرمی، غنائیت اور تخیل کی لطافت کے باعث اردو شاعری میں ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ ان کے اشعار میں حیرت، تنہائی اور جمالیاتی کشش کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو قاری کو ایک نیم خوابیدہ فضا میں لے جاتا ہے۔ وہ روایت سے جڑے رہتے ہوئے بھی اپنے لہجے میں ایسی نرمی اور رمزیت پیدا کرتے ہیں جو کسی اور شاعر کے ہاں اس شدت سے نظر نہیں آتی۔ ان کی غزل دراصل احساس اور منظر کے درمیان معلق ایک نغمہ ہے، جو دل میں اتر کر دیر تک گونجتا رہتا ہے۔

سلیم کوثر نے غزل میں روزمرہ زندگی، انسانی تعلقات کی پیچیدگی، اور احساس کی شفاف سچائی کو جگہ دی۔ ان کے اشعار میں عشق کی رعنائی کے ساتھ حیات کے تلخ حقائق بھی شامل ہیں۔ وہ روایت سے جڑے رہتے ہوئے بھی نئے زمانے کے دکھ اور تجربات کو بڑی نفاست سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں لہجے کی نرمی، زبان کی شستگی اور احساس کی صداقت نے غزل کو

انسانی تجربے کے قریب تر کر دیا۔
عدیم ہاشمی نے غزل میں فکری وسعت اور علامتی گہرائی پیدا کی۔ ان کے ہاں محبت ایک تجریدی تجربہ نہیں بل کہ ایک فکری اضطراب ہے۔ وہ غزل کے روایتی سانچے میں رہ کر جدید استعاروں اور علامتوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کے ہاں لفظوں میں فلسفہ سانس لیتا ہے، اور ہر شعر ایک فکری تمثیل میں بدل جاتا ہے۔ عدیم ہاشمی نے غزل کو جدید ذہن کے مکالمے سے ہم آہنگ کر دیا، اور اس میں تنہائی، وقت، اور وجودی بے قراری کے مضامین شامل کیے۔
خالد اقبال یاسر نے غزل کو ایک نیا فکری آہنگ دیا۔ ان کے ہاں روایت اور تجدد کا امتزاج نہایت نفاست سے جلوہ گر ہے۔ ان کی غزل میں زبان کی لطافت کے ساتھ فکر کی تازگی بھی موجود ہے۔ وہ عشق اور درد کو علامتی سطح پر بیان کرتے ہیں اور انسان کے اندر کے کرب کو ایک فلسفیانہ سکوت میں ڈھال دیتے ہیں۔ خالد اقبال یاسر کی شاعری میں مابعد الطبیعیاتی احساس، نفسیاتی تجزیہ اور روحانی تنہائی ایک ایسے شعری نظام میں ضم ہو جاتے ہیں جو اردو غزل کو نئی فکری سمت دیتا ہے۔ ان کی غزل میں جدید انسان کی گمشدگی، خواب، سوال اور شناخت کا مسئلہ بڑی لطافت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔
صابر ظفر کی غزل میں جدید لہجے کی روانی، شہری زندگی کی معنویت، محبت کے نئے زاویے اور فکری نرمی نمایاں ہیں۔ وہ روایت سے جڑے ہوئے ہیں مگر اس میں عہدِ حاضر کی نفسیاتی پیچیدگی، داخلی خلا اور جدید انسان کی بے چینی کو بڑی ہنرمندی سے سمو دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں زبان کی صفائی، خیال کی تازگی، اور جذبے کی صداقت نمایاں ہے۔
فرحت عباس شاہ غزل کو عام قاری کے دل کے قریب لایا۔ ان کے ہاں اظہار کی سادگی میں شدید جذباتی صداقت موجود ہے۔ انھوں نے غزل کو معاشرتی احتجاج، عشق کے زوال، اور انسانی اذیت کی زبان بنا دیا۔ ان کے اشعار میں ایک صراحت، ایک تڑپ، اور ایک صداقت ہے جو نوجوان نسل کے احساسات سے براہِ راست مکالمہ کرتی ہے۔ فرحت عباس شاہ نے غزل کو جدید معاشرتی و وجودی شعور کے ساتھ جوڑ کر اسے محض تغزل کی صنف نہیں رہنے دیا بل کہ ایک زندہ تجربہ بنا دیا۔
ڈاکٹر ابرار عمر نے غزل میں میر تقی میر اور ناصر کاظمی کی روایت کو جدت کا رنگ دیا یوں فیض سے منیر اور فراز، شکیب سے یاسر،

اور عدیم سے سلیم کوثر، صابر ظفر اور فرحت تک غزل کا سفر اپنے اپنے ہم سفروں اور ہم عصروں کے ساتھ ایک جمالیاتی تجربے سے نکل کر فکری گہرائی تک پہنچتا ہے۔ اس سفر میں محبت، احتجاج، تنہائی، خودی اور وقت سب شامل ہیں۔ اردو غزل نے اس طویل ارتقا کے دوران اپنے اندر وہ وسعت پیدا کی ہے جس نے اسے صرف روایت کی یادگار نہیں بل کہ عہدِ حاضر کی روح کا زندہ استعارہ بنا دیا ہے

اردو غزل ایک ایسی صنف بن کر ابھری جس میں تہذیبی شائستگی، روحانی تجربہ، فکری پیچیدگی اور لسانی لطافت سب کچھ جمع ہو گیا۔ اس نے ہماری بولی کو نغمہ دیا، ہماری زبان کو وقار دیا، اور ہمارے ادب کو وہ دلکشی عطا کی جو کسی اور صنف کے نصیب میں نہیں تھی۔ برصغیر کے عام آدمی کے لیے غزل اظہار کا سب سے قریب ترین وسیلہ بن گئی۔ چاہے وہ کسی محفلِ سماع میں ہو یا تنہائی میں، اس کی زبان پر غزل کا شعر ہوتا ہے۔ یہی غزل کا کمال ہے کہ وہ ایک ایسی لسانی روایت میں ڈھل چکی ہے جو عوامی اور اشرافی، دونوں کی زبان ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ غزل اپنی فنی خوب صورتی کے باوجود کبھی کبھار فکر کی وسعت کو سمیٹنے سے قاصر رہتی ہے۔ ہر شعر کا الگ مفہوم اور اس کی رمزیاتی ساخت اس کو وحدتِ تاثر سے محروم کر دیتی ہے۔ غزل کی یہی بکھری ہوئی ساخت اسے بڑے فکری مکالمے یا نظری تحریک کے لیے کم موزوں بناتی ہے۔ نظم اس خلا کو پُر کرتی ہے، کیوں کہ نظم ایک متصل فکر اور مربوط اظہار کا تقاضا رکھتی ہے۔

پھر بھی غزل اپنی روایت، لسانی نرمی اور جذباتی تاثر کی بنا پر اردو تہذیب کا سب سے محبوب شعری پیرایہ بنی رہے گی۔ یہ ہمارے اجتماعی وجدان کا صوتی اور جمالی حوالہ ہے۔ اگر نظم جدید ذہن کی عقل کی آواز ہے تو غزل ہمارے دل کی دھڑکن ہے۔ دونوں ایک ہی جسم کے دو رخ ہیں؛ ایک فکر کی وضاحت دیتا ہے، دوسرا احساس کی لطافت۔ لیکن جدید عہد جس کو واضح اظہار، مربوط ابلاغ اور فکری تسلسل کی ضرورت ہے، وہاں نظم کی بالادستی ناگزیر نظر آتی ہے۔ نظم اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس نے زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فکر اور ابلاغ کے نئے در وا کیے اگر غزل جذبات کی لطیف سرگوشی ہے تو نظم شعور کی بلند صدا ہے۔ غزل میں احساسات کی نرمی اور بیان کی تہذیب ضرور ہے مگر نظم میں فکر کی سمت،

جذبے کی سمت اور معنی کی سمت ایک ہی اکائی میں جمع ہو جاتی ہے۔ اقبال سے لے کر ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، منیر نیازی، احمد فراز، ن۔م۔راشد، اختر حسین جعفری، مجید امجد، آفتاب اقبال شمیم، ثروت حسین، فہیم جوزی، منظر حسین اختر، ڈاکٹر یونس خیال، اعجاز رضوی، شفیق احمد خان، فرحت عباس شاہ، ڈاکٹر ابرار عمر، مہناز انجم اور بعد کے شعرا تک نظم نے اس بات کو ثابت کیا کہ شعر صرف تغزل نہیں بل کہ تفکر بھی ہے۔ اقبال نے جب ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کہی تو انھوں نے نظم کو اجتماعی احساس اور امت کے فکری بحران کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے بعد نظم نے داخلی تجربے سے نکل کر فکری اور فلسفیانہ جہات اختیار کر لیں۔

نظم نے اردو شاعری میں اس لیے بھی انقلاب برپا کیا کہ اس نے بیان کے تمام روایتی قید خانے توڑ دیے۔ اب شاعر محض عاشق نہیں رہا، وہ فلسفی بھی ہے، مورخ بھی، اور ایک فکری موذن بھی۔ نظم نے موضوعات کی وسعت پیدا کی سیاست، معیشت، نفسیات، وجودیات، سائنس، محبت، موت، اور مذہب، سب کچھ اس کے دائرے میں آ گیا۔ نظم نے قاری سے صرف جذباتی تاثر نہیں مانگا بل کہ فکری شرکت کا تقاضا کیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نظم، غزل سے ایک قدم آگے نکلتی ہے۔

عہدِ حاضر کے انسان کی زندگی تیز رفتار، منتشر اور معلومات سے بھری ہوئی ہے۔ اسے کسی ایسے اظہار کی ضرورت ہے جو صرف حسنِ بیان نہیں بل کہ فکری وضاحت بھی رکھتا ہو۔ نظم اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس کا ڈھانچہ وحدت تاثر پر قائم ہے، اس میں آغاز، ارتقا اور انجام ایک لڑی میں بندھے ہوتے ہیں۔ قاری نظم پڑھتے ہوئے ایک فکری سفر طے کرتا ہے، ایک تجربہ جو اسے احساس سے آگے لے جا کر شعور تک پہنچاتا ہے۔ اسی لیے نظم جدید عہد کا سب سے موثر ابلاغی وسیلہ بن چکی ہے۔

نظم کی ایک اور خوبی اس کا بین الاقوامی افق ہے۔ چونکہ نظم کی بنیاد فکری تسلسل پر ہے، اس لیے یہ مختلف زبانوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرتی ہے۔ جدید انگریزی، فرانسیسی اور عربی شاعری کی طرح اردو نظم بھی انسانیت کے مشترکہ دکھ اور مشترکہ خواب کا اظہار بن گئی ہے۔ یہی اسے ''انٹرنیشنل سینس'' میں فہم و ابلاغ کا بہتر ذریعہ بناتا ہے۔

اگر ہم جدید دنیا کے ابلاغی پیمانوں پر غور

کریں تو نظم ان تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ وہ جدید ذہن کے منطقی ڈھانچے، اس کے سائنسی شعور اور اس کے وجودی سوالات کو اپنی زبان میں ڈھال سکتی ہے۔ نظم محض احساس نہیں بل کہ شعور کی تعبیر ہے۔ وہ فلسفے کو شاعری میں ڈھالتی ہے اور شاعری کو زندگی کی تشریح بنا دیتی ہے۔

اس لیے نظم جدید اردو شاعری کی فکری ریڑھ کی ہڈی ہے۔ وہ غزل کی طرح محدود دائرے میں محصور نہیں رہتی بلکہ اپنے موضوعات اور اسلوب میں مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ نظم ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ شاعری صرف نغمہ نہیں بل کہ آگہی بھی ہے، صرف حسن نہیں بل کہ حقیقت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے عہد میں نظم کو بہتر کمیونیکیشن یعنی بہتر ابلاغ کی صنف مانا جاتا ہے — وہ صنف جو دل سے بات کرتی ہے مگر عقل کو بھی مطمئن رکھتی ہے، اور یہی جدید انسان کا سب سے بڑا مطالبہ ہے۔

غزل اور نظم دونوں اردو شاعری کے ایسے دو ستون ہیں جو ایک ہی عمارت کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ احساس کی لطافت اور جذبے کی نرمی کا ہے، دوسرا رخ فکر کی گہرائی اور ابلاغ کی وضاحت کا۔ غزل کی بنیاد انفرادی تجربے، رمزیت، اور موسیقیت پر ہے، جب کہ نظم کی ساخت فکری تسلسل، وحدتِ تاثر اور شعوری ربط پر استوار ہے۔ غزل کے ہر شعر میں ایک الگ کائنات آباد ہے، ایک مکمل تجربہ جو اپنی جگہ خود مکتفی ہے۔ مگر نظم کے ہاں یہی تجربے ایک دوسرے سے جڑ کر ایک وحدت بن جاتے ہیں، جہاں آغاز، ارتقا اور انجام سب ایک فکری ربط کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ یہی ربط اسے جدید ذہن کے لیے زیادہ قابلِ فہم اور مؤثر بناتا ہے۔

غزل کا حسن اس کے اختصار میں ہے۔ دو مصرعوں میں ایک گہرا تجربہ، ایک درد، ایک فلسفہ یا ایک رمز بیان کر دینا غزل کا معجزہ ہے۔ مگر اسی اختصار نے اسے کبھی کبھار تاثر کی بکھراؤ میں بھی مبتلا کیا۔ چونکہ ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہے، اس لیے غزل کسی وحدتِ خیال یا مکمل بیانیہ تشکیل نہیں دے سکتی۔ نظم اس کے برعکس قاری کو ایک فکری سفر پر لے جاتی ہے۔ اس میں جذبہ، خیال اور ابلاغ ایک ہی لڑی میں بندھے ہوتے ہیں۔ یہی وحدتِ تاثر جدید شاعری کی روح ہے۔

غزل کی موسیقیت بے مثال ہے۔ بحر، قافیہ اور ردیف کی ترتیب ایک ایسا نغمہ پیدا کرتی ہے جو دل کو چھو لیتا ہے۔ لیکن نظم کی موسیقیت داخلی ہے، اس کے آہنگ میں فکر

کی روانی، جملوں کا توازن اور مفہوم کا بہاؤ شامل ہے۔ غزل کے الفاظ چمکتے ہیں، نظم کے مفاہیم گہرے ہوتے ہیں۔ غزل دل کو لبھاتی ہے، نظم ذہن کو روشن کرتی ہے۔ غزل کے حسن کا تعلق نغمگی سے ہے، نظم کے حسن کا تعلق معنویت سے۔

فنی لحاظ سے غزل ایک موروثی روایت ہے جس نے زبان کو ایک مخصوص تہذیبی وقار دیا، مگر فکری سطح پر نظم زیادہ تجرباتی اور انقلابی صنف ہے۔ نظم نے نئی علامتیں تراشیں، نئی ساختیں وضع کیں اور اردو شاعری کو عالمی فکری دھارے میں شامل کیا۔ دوسری طرف غزل نے جذباتی ابلاغ، لسانی لطافت، اور تہذیبی شائستگی کو زندہ رکھا۔

غزل میں استعارہ، تشبیہ اور رمز کلام کی آرائش ہیں، جب کہ نظم میں یہ تمام چیزیں فکر کے نظام کا حصہ بن جاتی ہیں۔ نظم قاری سے صرف لطف نہیں بل کہ غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے۔ غزل کی تفہیم کے لیے دل درکار ہے، نظم کی تفہیم کے لیے دل بھی اور عقل بھی۔ اسی لیے نظم جدید انسان کے ذہنی افق سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

جدید عہد میں جہاں سائنس، فلسفہ، نفسیات اور سماجیات نے انسانی زندگی کے ہر گوشے کو بدل دیا ہے، وہاں نظم ان تبدیلیوں کو جذب کر کے ایک جامع اظہار پیش کر سکتی ہے۔ غزل چونکہ اپنے روایتی سانچے میں قید ہے، اس لیے وہ ان وسیع فکری اور سائنسی مفاہیم کو مکمل طور پر سمیٹ نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ نظم عصری احساس، فکری جستجو اور اجتماعی ابلاغ کا مؤثر ترین ذریعہ بن گئی ہے۔

پھر بھی غزل کو کم تر نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ زبان کا وہ گہنا ہے جس نے اردو کو نغمگی اور دلکشی بخشی۔ غزل کے بغیر اردو شاعری کی شناخت ادھوری ہے۔ لیکن اگر شاعری کو فلسفے، شعور اور انسانی تجربے کے وسیع دائرے میں لے جانا ہو تو نظم ہی وہ کشتی ہے جو ہمیں اس بحرِ بیکراں میں لے جا سکتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ غزل خواب کی زبان ہے اور نظم بیداری کی۔ غزل جذبے کا بیان ہے، نظم شعور کا اظہار۔ غزل احساس کو نغمہ بناتی ہے، نظم اسے فکر کا قالب دیتی ہے۔ دونوں کی اپنی دنیا ہے، مگر جدید عہد کی فکری ترجمانی نظم کے ذریعے زیادہ مکمل اور عالمی سطح پر قابلِ فہم ہو پاتی ہے۔

غزل کا مستقبل دراصل اردو تہذیب کے مستقبل سے وابستہ ہے، کیونکہ یہ صنف ہماری روحانی و جمالیاتی وراثت کی سب سے گہری نمائندہ ہے۔ صدیوں سے غزل نے ہمارے احساس، گفتگو اور تخیل کو ایک

خاص لطافت بخشی ہے۔ مگر ہر زندہ روایت کی طرح غزل بھی اگر خود کو نئے عہد کے فکری مطالبات کے مطابق ڈھال نہ سکے تو محض ایک خوب صورت یادگار بن کر رہ جائے گی۔ آج جب انسان کے احساسات بدل چکے ہیں، جب سماجی رشتے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں، جب ابلاغ کی رفتار اور فکری وسعت بڑھ گئی ہے، تو شاعری کو بھی نئے اظہار کی ضرورت ہے۔ غزل اپنی روایتی ساخت میں محدود رہ کر ان وسعتوں کو نہیں سمیٹ سکتی۔ لیکن اگر اس کے اندر تجدید کی لہر پیدا ہو تو یہ صنف ایک بار پھر اپنے جمالی و فکری امکانات سے اردو شاعری کو نئی سمت دے سکتی ہے۔

تجدید کا مطلب روایت سے انکار نہیں بل کہ اس میں نئی روح پھونکنا ہے۔ غزل کی روایتی صورت — دو مصرعوں میں ایک مکمل تجربہ اپنی جگہ پر ایک فنی معجزہ ہے، مگر جدید شاعر کو چاہیے کہ وہ اسی قالب میں جدید انسان کی بے سمتی، اس کے ذہنی انتشار، اس کی وجودی گمشدگی اور اس کے معاشرتی زوال کو پیش کرے۔ نئی غزل میں یہی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ ندا فاضلی، جون ایلیا، پروین شاکر، افتخار عارف اور زاہدہ حنا جیسے شعرا نے غزل کو جدید لہجے اور نئے تاثر سے آشنا کیا۔ ان کے ہاں روایت موجود ہے مگر وہ روایت جامد نہیں؛ اس میں زندگی کے بدلتے رنگ، درد، محرومی اور احتجاج سب شامل ہیں۔

غزل کی سب سے بڑی قوت اس کی عوامی رسائی ہے۔ یہ زبانِ عام فہم ہے، مگر اپنے اندر تہذیبی وقار بھی رکھتی ہے۔ یہی خصوصیت اسے اردو کے عوامی شعور سے جوڑتی ہے۔ نظم چونکہ فکری اور ساختی لحاظ سے نسبتاً مشکل صنف ہے، اس لیے وہ عام قاری کے لیے کبھی کبھار اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں غزل کی بقا یقینی ہے۔ وہ عوام کے دل کی زبان ہے، ان کے دکھ، محبت، دعا اور احتجاج کا پیرایہ ہے۔ اس کی یہ داخلی ہم آہنگی ہی اسے زندہ رکھے گی۔

البتہ غزل کو صرف جذباتی اظہار تک محدود رکھنا اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اسے فکری وسعت کی طرف بڑھنا ہوگا۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ غزل میں صرف عشق کے استعارے نہ دہراتا رہے بل کہ نئے زمانے کے تجربات، سائنس، فلسفہ، نفسیات اور سماجیات کے زاویے بھی شامل کرے۔ اگر غزل میں انسانی شعور کی وسعت داخل ہو جائے تو وہ نظم کی طرح فکری طور پر بھرپور ہو سکتی ہے، مگر اپنے اختصار اور نغمگی کے ساتھ۔

عہدِ جدید میں یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ غزل اور نظم کے درمیان ایک نئی صنف جنم لے رہی ہے — جسے ہم آزاد یا بیانیہ غزل کہہ سکتے ہیں۔ اس میں شاعر روایتی ساخت سے کچھ آزاد ہو کر غزل کے لہجے میں نظم کی وحدتِ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ امتزاج دراصل اردو شاعری کی فکری بلوغت کی علامت ہے۔ روایت اور تجدد کے درمیان یہ مفاہمت اردو ادب کے مستقبل کی ضمانت ہے۔

غزل کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ وہ اب بھی ہمارے اجتماعی لاشعور میں دھڑک رہی ہے۔ مگر اب اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آئینے میں صرف حسنِ محبوب نہیں بلکہ زخمِ انسانیت بھی دکھائے، صرف سوزِ دل نہیں بلکہ شعورِ کائنات بھی۔ نظم جدید عہد کی فکری زبان ہے، لیکن غزل ہماری تہذیب کی روح۔ اگر یہ دونوں صنفیں اپنی اپنی حدود میں رہ کر ایک دوسرے سے مکالمہ کریں، تو اردو شاعری ایک نئی صبح دیکھ سکتی ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ غزل کا مستقبل روایت اور تجدید کے اس سنگم میں پوشیدہ ہے جہاں اس کی نغمگی، اس کا تغزل اور اس کا لسانی حسن برقرار رہے، مگر اس کے مضامین، اس کے استعارے اور اس کی فکر نئی دنیا سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ یہی وہ راہ ہے جو غزل کو زندہ بھی رکھے گی اور اسے عہدِ حاضر کے ابلاغی اور فکری چیلنجز کے لیے مؤثر بھی بنائے گی۔

شاعری کا سفر دراصل انسان کے شعور اور احساس کا سفر ہے۔ غزل اور نظم اسی سفر کے دو رخ ہیں — ایک دل کی دھڑکن، دوسرا ذہن کی بیداری۔ غزل نے ہمیں لطافتِ احساس عطا کی، زبان کو نغمگی دی، اور تہذیب کو جمالیاتی وقار بخشا۔ نظم نے ہمیں فکر دی، وضاحت دی، اور ابلاغ کی بین الاقوامی زبان عطا کی۔ اگر غزل نے ہماری روح کو گایا تو نظم نے ہمارے شعور کو جگایا۔ دونوں نے مل کر اردو شاعری کو ایک ایسا ہمہ گیر پیکر دیا جس میں عشق بھی ہے، عقل بھی، روایت بھی ہے، تجدد بھی، اور احساس کی سرشاری بھی۔

جدید عہد کا انسان جس تیزی، پیچیدگی اور فکری اضطراب سے گزر رہا ہے، اس کے لیے نظم زیادہ موزوں اظہار ہے۔ نظم اپنے تسلسلِ خیال، وحدتِ تاثر اور فکری وسعت کے باعث اس زمانے کے انسان کے ذہنی نظام سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس کے اندر وہ وضاحت ہے جو سائنس، فلسفہ اور نفسیات کے عہد میں ضروری ہو چکی ہے۔ نظم اپنے قاری

سے صرف دل نہیں بل کہ ذہن کی شرکت چاہتی ہے، اسی لیے اسے ''بیٹر کمیونیکیشن'' یعنی بہتر ابلاغ کی صنف کہا جا سکتا ہے۔ نظم جدید ذہن کی زبان ہے کیونکہ وہ زندگی کو محض جذبات کے آئینے میں نہیں بلکہ شعور کے عدسے میں دیکھتی ہے۔

دوسری جانب غزل ہماری روحانی اور تہذیبی شناخت ہے۔ یہ ہماری زبان کا گیت ہے، ہماری تاریخ کی خوشبو، ہماری محبتوں کی موسیقی۔ اس کے بغیر اردو شاعری کی عمارت نامکمل ہے۔ غزل میں وہ احساسِ تعلق ہے جو ہمیں اپنی تہذیب سے جوڑے رکھتا ہے۔ وہ زبان کی سادگی میں گہرائی رکھتی ہے، اور مختصر دائرے میں وہ سحر پیدا کرتی ہے جو نظم کی طوالت سے بھی ممکن نہیں۔ غزل کا ہر مصرعہ ہماری اجتماعی روح میں گونجتا ہے، گویا یہ صنف ہمارے شعور کا فطری اظہار بن چکی ہے۔

یوں نظم اور غزل میں کوئی حقیقی تصادم نہیں بلکہ ایک تخلیقی تقسیمِ کار ہے۔ غزل دل کو روشن رکھتی ہے، نظم عقل کو بیدار۔ غزل ہمیں اپنی روایت سے جوڑتی ہے، نظم ہمیں دنیا سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ ایک ہمیں ماضی کی یاد دلاتی ہے، دوسری مستقبل کی سمت دکھاتی ہے۔ غزل ہمیں احساس کی پاکیزگی سکھاتی ہے، نظم ہمیں شعور کی روشنی عطا کرتی ہے۔ یہی توازن اردو شاعری کی بقا کی ضمانت ہے۔

آج کے دور میں اگر شاعر غزل کی رمزیت کو نظم کی فکری ساخت سے جوڑ سکے، تو اردو شاعری ایک نئی زندگی حاصل کر سکتی ہے۔ یہی امتزاج جہاں تغزل کی لطافت نظم کی وضاحت سے ملتی ہے وہ تخلیقی کمال ہے جس پر اردو ادب اپنی عالمی شناخت قائم رکھ سکتا ہے۔

آخر کار یہ کہنا بجا ہے کہ نظم عہدِ جدید کا چہرہ ہے اور غزل اس کا دل۔ نظم ابلاغ کا نیا باب ہے، غزل احساس کا قدیم گیت۔ نظم کے بغیر شاعری بین الاقوامی گفتگو میں شامل نہیں ہو سکتی اور غزل کے بغیر شاعری اپنی روح کھو دیتی ہے۔ دونوں کی بقا ایک دوسرے سے وابستہ ہے، جیسے شعور بغیر احساس کے ادھورا ہے، اور احساس بغیر شعور کے اندھا۔

اسی امتزاج میں اردو شاعری کی اصل بقا پوشیدہ ہے کہ وہ روایت کے حسن کو تجدید کے شعور سے جوڑ کر اپنی تہذیبی اور فکری شناخت کو نئی صدیوں تک برقرار رکھے۔ یہی اس مضمون کا حاصل ہے، یہی شاعری کا مقصد: کہ لفظ انسان کے باطن سے نکل کر اس کے زمانے کی روح سے ہم کلام ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

سخن کی جان.........جان کاشمیری

جان کاشمیری کے اشعار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بہ یک وقت قاری، سامع، ناقد اور مشاہیر اُردو ادب کو ادراک کے ساتھ ساتھ انتقادی شعور بھی دیتے ہیں اور اُن کے اشعار قاری کو لطف و سرور، سامع کو غنائیت کی بہار، ناقد کو تفہیم کی رو اور مشاہیر کو وجدانی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اُن کے اشعار کی بنیاد خوب صورت الفاظ پر ہوتی ہے اور جو شعر میں زورِ سخن پیدا ہوتا ہے اور حُسن و جمال بھر جاتا ہے۔ وہ بھی پُر تاثیر الفاظ کا مرہونِ منت ہوتا ہے کیوں کہ سماعت پر گراں گزرنے والے الفاظ غزل کا مزاج نہیں رکھتے اور جان کاشمیری نے اس بات کا خصوصی طور پر خیال رکھا ہے کہ ایسے الفاظ اُن کی غزل میں نہ آئیں جو سننے میں بدذوقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جان کاشمیری کی غزلیات میں سب سے اہم چیز جمال لفظیات ہے جس کی بنیاد پر وہ معمولی بات کو بھی الفاظ کے حُسن سے حسین وجمیل بنا دیتے ہیں۔ اگر شاعر اچھا ہے تو وہ انسان کے شدید جذبات (پیار، نفرت، غصہ اور خوف)، تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات اور نازک احساسات کو برمحل و موقع الفاظ میں ڈھال دیتا ہے تو اُس کے کلام میں شعریت لازمی در آتی ہے۔ جان کاشمیری نے ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ذہن میں آنے والے خیالات، دماغ پر چھانے والے تصورات اور دل میں راسخ ہونے والے تاثرات کو الفاظ میں ڈھال دیا ہے جس کے سبب ان کے تمام اشعار میں شعریت در آئی ہے اور ان میں غنائیت کا حُسن سمٹ گیا ہے۔ اِس لیے کسی شاعر کے لیے لازم ہے کہ وہ جن خیالات و جذبات اور تخیلات کو بیان کرنا چاہتا ہے اُن کے لیے الفاظ کا انتخاب اُن جذبات و خیالات کی روح کے مطابق کرتا ہے جو عام انداز میں بیان کرنے کی روش سے ہٹ کر دل و

ریاض ندیم نیازی

دماغ کو اس طرح اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ لفظیات کی مقناطیسیت کا نام شاعری ہے۔ محاسنِ الفاظ شاعری کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں جس کے لیے شاعر کو زبان پر قدرت ہونی چاہیے۔ یہ شاعری کے لیے پہلی شرط ہے اور میں نے جان کاشمیری کے ایک درجن سے زائد شعری مجموعوں کا مطالعہ کیا ہے، اُن کے تمام کلام میں یہ بنیادی خوبی موجود ہے۔ اس بنا پر میں انھیں گوجرانوالہ کا نمائندہ شاعر تسلیم کرتا ہوں اور شعرائے پنجاب کی اوّل فہرست میں اُن کا نام سرِ فہرست لکھتا ہوں، کیوں کہ جو شاعر الفاظ کو اپنا مطیع و فرماں بردار نہیں بنا سکتا وہ اچھی شاعری کا نمونہ زندگی بھر پیش نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ہزاروں شاعر تخلیقِ شعر میں ہر وقت مگن و مصروف رہتے ہیں، مگر ادب کے منظر نامے پر چند شاعر ہی اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور وہی شہرت کے آسمان پر چمکتے ہیں اور اپنے پیغامات سے نسلِ نو کو معلومات و آگاہی فراہم کرتے ہیں، اور وہی شاعر اور اُن کا کلام زندہ رہتا ہے، اُن شعرائے اُردو میں جان کاشمیری کا شمار بھی ہوتا ہے۔

خیال کتنا ہی حسین ہو، اس کے لیے حسین الفاظ کا چناؤ، اہم اور ضروری ہوتا ہے جس میں جان کاشمیری کو مہارت حاصل ہے۔

جان کاشمیری اِس دور کے بڑے اور اہم شاعر ہیں، لیکن انھیں ابھی تک وہ مقام نہیں مل سکا ہے جو اُن کا حق ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں گروپنگ اور لابنگ اور تعصب پرستی بہت زیادہ ہے۔ ہر صاحبِ اختیار و صاحبِ اقتدار شاعر ہر ادبی کانفرنس، مشاعرے، ادبی مذاکرے اور ادبی پروگراموں اور تقریبِ رونمائیوں میں اپنے ہی گروپ کے شعرا کا نام دیتا ہے اور انھیں کو آگے بڑھاتا ہے اور دیارِ غیر بھیجنے کے لیے بھی اپنے بندوں ہی کو پروموٹ کرتا رہتا ہے۔ یہ ادبی بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جان کاشمیری کسی گروپ کا حصہ نہیں ہیں اور نہ وہ کسی لابنگ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ بھی اُن کے حق میں بہتر ہے کیوں کہ ایک اچھا اور دیانت دار سخن ور اپنے سخن پر توجہ دیتا ہے اُس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ادبی سیاست کے لیے اپنا وقت برباد کرے۔ اگر کوئی شاعر ایسا کرتا ہے تو وہ توانا اور پُر تاثیر سخن تخلیق نہیں کر سکتا اور وہ مقدار و معیار میں دیگر عبقری شعرا سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

مگر جان کاشمیری کا سخن مقدار و معیار ہر دو لحاظ سے قابلِ ذکر، قابلِ مطالعہ اور لائقِ تحسین ہے۔ انھوں نے غزلیات پر بھرپور توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دس شعری مجموعے بہ یک وقت زیورِ طباعت

سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے تو اُردو ادب کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور ایک نیا ریکارڈ قائم ہو گیا۔ کہنے کو تو یہ بات عام سی ہے کہ دس شعری مجموعوں کی ایک ساتھ طباعت، مگر اُن میں شامل کلام غیر معمولی نوعیت کا کلام ہے جس کی تخلیق میں برس ہا برس صَرف ہوئے ہوں گے اور جان صاحب نے کس قدر دماغ سوزی سے کام لیا ہوگا۔ دل کا لہو فکر کے چراغوں میں جلایا ہوگا تب کہیں یہ سرمایہ سخن ہاتھ آیا ہوگا۔
جان کاشمیری نے غزل و نظم کے ساتھ ایک نیا اور منفرد تخلیقی کام بھی کیا ہے اور وہ ہے مطالع کی تخلیق، اور ان ہزاروں مطلعوں کی تخلیق کے بعد ان کو کتابی صورت میں بھی طباعت کی زینت بخشی ہے۔ اُن کی مطالع کی تخلیق غیر معمولی نوعیت کی ہے جو مقدار اور معیار کے لحاظ سے سب سے الگ، منفرد اور وقیع کام ہے جس کی گرد کو بھی کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکتا۔ جان صاحب کا یہ تخلیقی کام ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تسخیر ہے جو انھی کا خاصہ ہے۔ اس میں انھوں نے اُردو شاعری کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا ہے اور ہر ایک مطلعے میں ایک پورے فلسفے کو سمو کر آگاہی بخش کام کیا ہے اور دیگر شعرائے اُردو خصوصاً نئی نسل کے شعرا اور نوآموز و تازہ کار شاعروں کو ایک نئی جہت سجھائی ہے۔ مطالع کی اُس صنف پر اتنا کام کیا ہے جو کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے ہر مطلع کو سجا کر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔
میں یہاں یہ بات پورے وثوق سے لکھ رہا ہوں کہ جان صاحب کی غزلیہ شاعری میں وہ سب کچھ ملتا ہے جو یورپی مفکرین نے شاعری کی تعریف میں کہا ہے اور وہ تمام محاسنِ سخن بھی جان صاحب کی شاعری میں پائے جاتے ہیں جن کا ذکر اُردو کے جید ناقدین نے کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں سبھی تعریفوں کا عرق ملتا ہے۔ میں یہاں ان کے اشعار مثال میں پیش نہیں کر رہا کہ مضمون کو طوالت سے بھی بچانا ہے اور اُن کے اشعار کی قرأت اور غزل کی تلاوت کا اصل لطف و سرور اُن کی کتابوں کے مطالعے سے ملے گا۔ میں پاکستان کے صفِ اوّل اور رواں صدی کے نمائندہ شاعر کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُن کے کام کو قابلِ تحسین سمجھتا ہوں کہ جس سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہوا ہے اور وہ تاریخ اُردو ادب کا حصہ بھی بنا ہے۔
جان کاشمیری کا کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی نظر شعور اور لاشعور پر بہت گہری ہے۔ اُن کے اشعار کی تشریح و تفسیر کی جائے تو چند الفاظ پر مشتمل نظر آنے والا شعر اپنے اندر معانی و مفاہیم کا ایک بحرِ بے کراں رکھتا ہے۔ اُن کے بعض اشعار میں مکمل فلسفہ سمویا

ہُوا ملتا ہے جس کی جتنی پرتیں کھولی جائیں وہ اُسی قدر تہہ در تہہ کھلتا چلا جاتا ہے اور معانی ومفاہیم کے نئے نئے در وا کرتا ہے۔ شاعرِ موصوف کے کلام میں علمِ نفسیات کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں جو شاعر انسان کی نفسیات اور اس کے تقاضوں سے واقف ہوتا ہے وہ انسان کے اندر جھانک کر اُس کے دل کا راز پا جاتا ہے اور اُس کے دل کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ جان کاشمیری نے بھی اپنے کلام میں انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے اور اُس کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اشعار کو خیالات سے سجایا ہے۔ یہ کام وہی شاعر کر سکتا ہے جو وسیع المطالعہ ہو اور دنیا بھر کا ادبِ عالیہ اُس کے نظروں سے گزرا ہو۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ جان کاشمیری ایک زیرک اور طباع شاعر ہیں جنھوں نے عہدِ قدیم سے لے کر عہدِ موجود تک کے شعرائے اُردو کا کلام پڑھا ہے اور اُن کے محاسن سے استفادہ کیا ہے۔

جان کاشمیری کو اپنی ذات سے آگاہی بھی ہے، وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے، یہاں تک کہ اپنے کلام میں بھی وہ بات نہیں کہتے جو اُن کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو، انسان پر ایسے لمحات اور ساعات بھی آتے ہیں جب وہ اپنے روبرو آنے اور اپنی ذات کا سامنا کرنے سے گھبراتا اور کتراتا ہے، جب وہ ایسے حالات و واقعات اور کیفیات سے دوچار ہوتا ہے تو ایسا شخص بے حد حساس ہو جاتا ہے اور اُس کی وہ تمام حساسیت اُس کے فن میں نظر آتی ہے۔ اگر وہ مصور ہے تو اُس کی تصویر کشی اُس بات کی گواہ بن جاتی ہے، اور اگر وہ شاعر ہے تو اُس کی شاعری میں یہ عکس بہت نمایاں ہو کر اُبھرتا ہے۔ میری نظر میں یہی فن ہے جو فن کار کے ہنر کی غمازی کرتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہی اصل فن ہے اور اُسی فن میں رہنے کو اصل جینے کا ہنر کہا جاتا ہے۔ جینے کو تو سبھی جی لیتے ہیں، مگر حساسیت اور اپنی ذات کی آگاہی کے ساتھ جینا ہی اصل جینا ہے جو انسان کو عزتِ نفس اور خودداری کا احساس دلاتا ہے تو انسان کو اپنی ذات کا عرفان ہوتا ہے اور جو شخص خود کو پہچان جاتا ہے وہ خود سے خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ جان کاشمیری بھی اُسی خودآگاہی سے آشنا ہیں جس کی بنیاد پر وہ جب کسی چیز کی محرومی و مایوسی کے حصار میں گھر جاتے ہیں تو وہ خود کلامی میں خودآگاہی کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی نامکمل خواہشات اور مفادات کو پورا کرنے کی اُمید میں اپنی اَنا کو بھی زیر کر دیتے ہیں اور جس شاعر میں اَنا کو زیر کرنے کی خوبی ہو، وہ آفاقیت کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جان کاشمیری نے اپنی اَنا کو زیر کر کے اُس پر قابو پا لیا ہے اور اُن کی سوچ کی گہرائی اور فکر

کی وسعت اب اُن کے ہر شعر میں نظر آنے لگی ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے لکھ رہا ہوں کہ جان کاشمیری کے کلام میں خیال کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی ان کی اعلیٰ سوچ کی گواہی دیتی ہے اور اُن کو عہدِ حاضر کا منفرد و ممتاز شاعر بناتی ہے اور اُن کو ان تمام شعرائے اُردو سے ممتاز کرتی ہے جو اُن کے ہم عمر اور ہم عصر ہیں اور یک سانیت کی شاعری کر رہے ہیں۔ ان تمام شعرائے اُردو میں شاعرِ موصوف کا لہجہ بالکل جدا ہے۔ اُن کا ہنر سب سے منفرد ہے اور انداز سب سے الگ ہے۔ اُسی انفرادیت نے ان کے کلام میں آفاقیت پیدا کر دی ہے جس کی بنا پر ہم اُن کو آفاقی شاعر کہہ سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا محاسن سے اُن کے کلام کی عظمت میں اضافہ ہُوا ہے اور اُن کی شاعری کی قدر و قیمت بڑھی ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی نکتہ آفریں بات کو سہلِ ممتنع میں ڈھال دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں سہلِ ممتنع کی بے شمار عمدہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ جان کاشمیری عصرِ رواں کے اُن شاعروں میں سرِ فہرست ہیں جو سہلِ ممتنع میں کہنے پر مہارت رکھتے ہیں، یہ اُن سب کے سرخیل ہیں۔ میں نے اُن کے ہزاروں ایسے اشعار نشان زد کیے ہیں جو سہلِ ممتنع کی مثالوں میں نہ صرف پیش کیے جا سکتے ہیں بل کہ انھیں نمایاں جہت میں مقابلتاً رکھا بھی جا سکتا ہے، کیوں کہ جان کاشمیری نے سامنے کی بات کو نہایت سہل اور آسان انداز میں بل کہ روزمرہ کی گفتگو کے طور پر منظوم کر دیا ہے کہ ایک بڑی تفصیل کو اجمال میں پیش کرنے پر وہ دست رس رکھتے ہیں۔ انھوں نے بشری تقاضوں اور فطرت کے نظام کو بہت عام فہم انداز میں مصور کیا ہے۔ اُن کا تصورِ جمال بڑا حیرت آفریں ہے کہ اس میں سنجیدگی زیادہ ہے۔ یہی سنجیدگی اُن کا تصورِ جمال اور احساسِ حسن کو غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی طرف بلاتا ہے۔ اُن کے احساسِ جمال میں شعلگی بھی ہے اور تپش بھی، یہ حرارت شعر فہمی کے جسم میں زندگی کی رمق کو متحرک کرتی ہے۔ یہی تحریک اُن کے اشعار میں روح پھونک دیتی ہے اور وہ چلتے پھرتے اور حرکات و سکنات کرتے نظر آتے ہیں۔ اُس تحریک کی بنیاد پر اُن کا کلام زندہ رہنے والا بن گیا ہے اور اُن کے اکثر اشعار سینہ بہ سینہ سفر کر رہے ہیں۔ میں یہ بات ثابت بھی کر سکتا ہوں کہ جان کاشمیری کا نام اُس صدی کے نمائندہ شعرائے اُردو میں لکھا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ رواں صدی اُن ہی کے نام ہو جائے کیوں کہ وہ ابھی بہ قیدِ حیات ہیں اور اُن کی شاعری کا سفر مسلسل ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

روشنی اور خوابوں کا شاعر......ڈاکٹر نذر عابد

پروفیسر ڈاکٹر نذر عابد ہزارہ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ اُردو رہے؛ وہاں سے سبک دوشی کے بعد آج کل ناردرن یونی ورسٹی نوشہرہ کے شعبہ اُردو سے وابستہ ہیں۔ نوے کی دہائی کے شروع میں میری اُن سے تب شناسائی ہوئی؛ جب (مرحوم) ملک حق نواز خاں نے ان کا ذکرِ خیر کیا۔ ملاقات کھاریاں کے اُس مشاعرے میں ہوئی؛ جس کی صدارت احمد فراز کر رہے تھے۔ پھر کسی نہ کسی سطح پر ہمارا رابطہ رہا اور یہ سلسلہ ذہنی سطح پر تب مضبوط ہوا؛ جب ملک حق نواز خاں کی وساطت سے ان کا پہلا شعری مجموعہ ''شہرِ صدا'' موصول ہوا۔ یہ ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ادبی تنظیم قلم قافلہ کھاریاں کے تحت سال کے بہترین غزل گویوں کا مقابلہ ہوا تھا اور اس مشاعرے میں اُن شعرا کو ایوارڈ بھی پیش کیا جانا تھا؛ جنھوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ منصفین نے میرے ضلع اٹک کے دو شاعروں پروفیسر ڈاکٹر نذر عابد اور پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کو بالترتیب اوّل اور دوم درجے سے نوازا تھا۔ گویا موصوف کی غزل سے جڑت کو چوتھی دہائی ہے اور زیرِ نظر کتاب ''درِ خاک'' حال ہی میں شائع ہوئی جو غزلیات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر نذر عابد نے اپنی غزل کی بنیاد کلاسیک کی اُس مضبوط روایت پر رکھی ہے؛ جس میں میرؔ و غالبؔ چمکتے ہیں اور ناصر و فراق اس سلسلے کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ گل و بلبل اور ساغر و مینا کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں بل کہ اُن کے یہاں عصری حسیت پوری طرح روشن اور نمایاں ہے۔ اُن کی شاعری کا اُسلوب روایتی ہے، نہ مضامین گھسے پٹے

خاور چودھری

ہیں بل کہ اُن کی شاعری میں روایت کا سلیقہ اور قرینہ اپنی ارفع شکل میں ظہور کرتا ہے اور فکری سطح پر وہ لمحۂ موجود کے سلگتے مسائل کو اس شان سے بیان کرتے ہیں کہ فن کے تال میل سے وہ باتیں بھی تغزل کا حصہ بن جاتی ہیں؛ جو آسانی کے ساتھ نعرہ ہو سکتی ہیں۔ اُنھوں نے خود کو نعرہ بازی سے بچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اُن کا شعر اس معنی میں روایت سے ہم رکاب ہے۔

موضوعات کی بوقلمونی ہے اور خاص کر ہماری معاشرت کو درپیش مسائل کو اُنھوں نے دردمندی اور غم گساری کے احساس کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جدید دُنیا کی بدلتی ہوئی سماجی زندگی میں فرد کے باطن کو جس مہم جوئی کا سامنا ہے اور جس طرح اس کے درون میں شعلے جلتے ہیں؛ اُن سے خس و خاشاک ہوتے زمانوں کو ایک فن کار ہی بہتر طور پر دیکھ اور پیش کر سکتا ہے۔ نذر عابد کی تخلیقی روش اس خصوص میں یہ امتیاز رکھتی ہے کہ وہ سرسری جہان سے نہیں گزرے بل کہ ہر منظر اور ہر لمحے کو خود پر طاری کر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ سامراجیت کے مظالم ہوں؛ ثقافتی یلغار ہو؛ معاشی عدمِ استحکام ہو؛ سیاسی عدمِ استحکام اور انارکی ہو؛ حاکمانِ وقت اور مقتدر حلقوں کی نرگسیت ہو؛ دہشت گردی ہو اور اُس کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی ذہنیت ہو یا پھر آمریت اور نام نہاد جمہوریت کا جبر ہو؛ اُنھوں نے ہر ہر مقام اور کیفیت کو شعری قرینہ عطا کیا۔ اُن کا اُسلوب سادہ اور زود اثر ہے۔ گویا وہ میر کے پیروکاروں میں سے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع کے عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کے یہاں بھاری بھرکم علامتیں، دُور از کار استعارات، مبہم تمثیلیں اور ثقیل تراکیب شاذ ہی دکھائی دیتی ہیں۔ اُنھوں نے اظہار کا جو قرینہ اختیار کیا ہے وہ قاری کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ چناں چہ اُن کی شاعری میں بڑی سے بڑی بات اور بڑے سے بڑا فلسفہ آسانی سے جگہ بنا لیتا ہے۔ ”در خاک“ کے تناظر میں دیکھا جائے تو اُن کے یہاں تین رنگ: روشنی، جرأت اور خواب کی صورت میں بار بار طلوع ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ کہیں استعارہ بنتے ہیں؛ کہیں علامت بنتے ہیں اور کہیں واضح للکار۔ یوں معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے انھی تین کو زندگی کا بنیاد جزو قرار دیا ہے۔ روشنی جو بجائے خود ایک طاقت ور شے ہے اور جس کی موجودگی سے تمام جہان منور اور توانا ہے۔ پھر دلیری اور بہادری کسی اور منطقے کی چیز نہیں بلکہ اسی سیارے پر ایسے ایسے سورما ہو گزرے ہیں؛ جن کی ہیبت سے زمانہ لرزتا تھا اور جو آنکھیں بصارت کے نُور سے اگرچہ چمکتی ہوں مگر خواب نہ

رکھیں تو اُن کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ گویا جن آنکھوں میں خواب ہوں؛ وہی صاحبِ بصیرت اور صاحبِ بصارت کے منصب پر سرفراز کرتی ہیں۔ ڈاکٹر نذر عابد کے یہاں یہ تینوں باہم مربوط ہو کر ظہور کرتے ہیں۔ ان کا شعری نظام انھی سے استحکام آشنا ہوتا ہے اور ایک الگ حوالہ، ایک الگ شناخت اور ایک الگ ذائقہ بن جاتا ہے۔ یوں اُن کے فکر کی شفافیت، جذبے کی صداقت، احساس کی ندرت اور بیان کی خوش سلیقگی قاری کو اپنے حصار میں لینے لگتی ہے۔

نذر عابد کی شاعری میں اُتم اور مدھم سُر ایک ساتھ طلوع ہوتے ہیں۔ جہاں بلند آہنگی مطلوب ہوتی ہے؛ وہاں اُن کا شعر خود بہ خود ارتفاعی فضا بناتا ہے اور جہاں کومل سُروں کی ضرورت ہو؛ اُن کا شعر اس فضا میں بآسانی آجاتا ہے۔ ان کے شعر میں کمال کی طاقت ہے، جو ہر موضوع پر قادر ہے۔ تقدیسی موضوعات ہوں؛ عمرانی عنوانات ہوں؛ سیاسی مسائل ہوں؛ سامراجیت ہو یا پھر حسن و عشق کا قضیہ، ہر کہیں ایک جیسے بہاؤ اور تازگی کے ساتھ اُن کا قلم بڑھتا چلا جاتا ہے۔

"درِ خاک" کے پردے میں وہ اُس مسافر کی صورت دکھائی دیتے ہیں؛ جو قریہ قریہ گھومتا ہے اور گھاٹ گھاٹ سے پیتا ہے لیکن اپنی اصل کو سلامت رکھتا ہے۔ وہ منظروں سے حظ تو اُٹھاتا ہے لیکن اُن میں گم ہو کر اُن کا حصہ نہیں ہو جاتا بل کہ اپنے بنیادی وظیفے کو یاد رکھتا ہے۔ روشنی، جرات اور خواب سے بننے والی تکون فکر و بیان کی سطح پر محدود نہیں رہتی بل کہ بیک وقت اُس سے کئی کرنیں پھوٹتی ہیں؛ جو جذب و احساس میں ہل چل پیدا کرتی ہیں اور یہ اضطراب قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر کچھ اشعار درج کر رہا ہوں، پورا ذائقہ تو کتاب کے مطالعے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے:

جگنوؤں کی جلتی بجھتی مشعلیں گویا کہ ہیں
مصحفِ شب پر کوئی خوابِ سحر لکھے ہوئے

یہ جو ملی ہے روشنی، یہ جو ملی ہے آگہی
کچھ ہے یقیں کے سلسلے، کچھ یہ گماں کے رنگ ہیں

وہ جس کی لَو سے منور ہیں دل کی سب راہیں
محیطِ شب میں وہ خوابِ سحر سلامت ہے

اہتمائے شب کو راس نہ آئی یہ روشنی
ہاں! جان بوجھ کر ہی بجھایا گیا ہوں میں

شامِ ابد کنار تلک ہو گئی روشنی
صبحِ ازل میں خوب لٹایا گیا ہوں میں

اندر کے اندھیروں سے اُلجھتا ہی رہا ہے
دل ہے کہ مری ذات کی بستی کا دیا ہے

روشنی کا کوئی کوندا سا لہو میں لپکا
کوئی نروان کی ساعت ہے، کوئی گوتم ہے

شب سہی لیکن فلک پر کیا کوئی تارے نہیں
ظلمتوں کے بیچ کیا یہ نور کے دھارے نہیں

ہمارے دل میں کچھ روشن دیے رکھے گئے تھے
سو دہلیزِ شبِ ظلمت پہ ہم روکے گئے تھے

اسی باعث میں تعبیروں کا جویا ہوں ازل سے
مری مٹی میں شاید خواب بھی گوندھے گئے تھے

یہ روشنی میں نہائی آواز کس کی آئی
تمام دکھ ہے، تمام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

یہ روشنی ہے اس کو یہ ہر سو بکھیر دے
اُجلی جو سوچ ہے، اسے مت یرغمال رکھ

تیرہ و تار راہ میں، ثبت نقوشِ پا ترے
ایسے تھے روشنی بھرے، جیسے چراغ جل اُٹھے

اندھیروں سے بھلا کیا خوف آئے گا مجھے اب
مرے ماتھے پہ اک روشن کرن لکھ دی گئی ہے

کیوں خوف مسلط ہو بھلا لشکرِ شب کا
کیا طاقچۂ جاں میں دیا کوئی نہیں ہے

مرے رستے میں تعبیریں بچھی ہیں
مری آنکھوں میں خوابوں کے خزینے

شبِ تیرہ کے ملبوسِ سیہ پر
یہ ہم روشن ستارے جڑ رہے ہیں

بس یہی اثاثہ تھا جسے سینت کر رکھا
آنکھوں سے کوئی خواب گرایا ہی نہیں ہے

خواب کیسے ہیں جن کے ہاتھوں ہم
نیند آتی ہے، سو نہیں سکتے

خیال فلک سے ستارے چنتے تھے
مٹی میں کچھ خواب اُگاتے رہتے تھے

اندھیری رات کو روشن جھلک نہ مل جائے
وہ ڈر رہے ہیں، زمیں کو فلک نہ مل جائے

کئی ویران آنکھوں کے کنارے
نئے کچھ خواب بونا چاہتا ہوں

نئے چراغ، نئے طاقچے بناتے ہیں
کہ روشنی کے نئے زاویے بناتے ہیں

ہم نے مٹی میں خواب بوئے تھے
اور ستاروں کی پھر کٹائی کی

چلو اب نسلِ نو کو خواب سونپیں
زمانہ ہاتھ ہم سے کر گیا ہے

روشنی شاید زمیں سے اُگ پڑے
دیکھتے ہیں اب یہاں بو کر دیا

یہ رستہ ہے تاریک بہت، تاریکی میں
اب دیا ہتھیلی پر کیا دھرنا، سر ہی لے

کچھ ایسا کرلیں کہ اب شب گزیدہ آنکھوں کو
نئی سحر کے مناظر دکھا دیے جائیں

....

ڈاکٹر نذر عابد کے یہاں ''شجر'' بھی کئی صورتوں میں طلوع ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ''پہلی بارش'' کے انداز میں کہی گئی کچھ غزلیں بھی موجود ہیں اور خراجِ تحسین کا سلسلہ بھی ہے۔ ایک غزل میں قافیہ'' قلماتے'' اور ''صحراتے'' بھی ہے؛ جب کہ ایک غزل کے قوافی انگلش زبان سے لیے گئے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے: ای میل، ان ہیل، سیل، ڈیٹیل، فیل، کرٹیل، ڈی ریل۔
ڈاکٹر نذر عابد کی غزل کا یہ سفر جذبے کی سچائی اور تجربے کی کٹھالی میں براہ راست بھی دکھائی دیتا ہے اور صدیوں کی دانش و بینش کی سہتا پر بھی نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے دونوں کو کمال ہنرمندی اور ذاتی صلاحیتوں سے یوں اُجال دیا ہے کہ ایک تیسرا آہنگ اور ایک نئی وضع کا در وا ہوتا نظر آتا ہے۔ ان کی غزل میں تہ داری کی ایک ایسی روش بھی ہے جو تغزل کی جملہ خوب صورتیوں کو لے کر خرام آمادہ ہوتی ہے تو اس کے جلو میں کئی کرنیں بھی قدم قدم چلتی ہیں۔ مجموعی طور پر ''درخاک'' کا جہان ہفت رنگ ہے جہاں ہر سمت ایک نئی صبح، ایک نیا ستارہ، ایک نئی خوشبو، ایک نیا ذائقہ، ایک نئی تلچھٹ، ایک نیا امکانیہ سرفراز ہوتا ہے۔ بلاخوف تردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اُس عاشقِ صادق کی کتھا ہے جو محبوب کی طلب میں دشت و بیابان، وادی و صحرا اور جنگل و دریا چھان آتا ہے تو اُس کے چہرے پر لذتِ ہجر و وصال کے کئی رنگ ایک ساتھ ظہور کرتے ہیں اور اُس کی شخصیت اور کردار کو تر و تازہ کر جاتے ہیں۔ صحیح معنوں میں یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر نذر عابد نے غزل کا تمام تر لوازمہ اُٹھا کر اپنے شعری صورت گری کی ہے۔ اس اعتبار سے بھی اور جدید و قدیم آہنگ کے حوالے سے بھی یہ مجموعہ لائقِ توجہ ہے اور رہے گا۔

☆☆☆☆☆

"تحقیق و تخلیق: تجزیاتی مطالعہ"

انسانی تاریخ نے اپنے ارتقائی سفر میں مختلف ادوار کا سامنا کیا ہے۔ اس ارتقائی سفر میں کئی تہذیبی و ثقافتی و تاریخی و جغرافیائی و تمدنی اور سیاسی نشیب و فراز سے پالا پڑا۔ یہ بھی سچ ہے کہ انسانی زندگی پر مختلف ادوار نے مختلف اثرات چھوڑے ہیں اگر فلسفے کے راج کے زمانے کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس دور کے ادبا، سخن وروں، شاعروں اور دیگر اصناف ادب پر لکھنے والوں کی سوچ پر فلسفے نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں اسی طرح سے اگر سائنسی دور کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو سائنس کے دور کے لکھنے والوں کے قلم کی نوک سے سائنسی، اختراعی اور منطقی نوعیت کے موضوعات پر قلم اور تحریر میں سائنسی اثرات نمایاں نظر آئیں گے۔ آزادی، جنگ و جدل، غدر، تحریک آزادی اور مزدور و محنت کش کے استحصال کے زمانے کے ادب کو دیکھیں گے تو ادب پرور اس فکر اور سوچ کے فروغ کے داعی نظر آئیں گے۔ زمانی اثرات اور فکری نظام پر ان موضوعات کا فروغ پانا فطری امر ہے۔ الغرض انسانی ارتقائی سفر میں جس جس دور میں جیسا جیسا ادب تخلیق ہوا وہ اپنے دور کی حمایت یا مخالفت میں تخلیق ہوا جیسے مزاحمتی ادب وغیرہ۔ زمانے میں غالب سوچ کا ارتداد اور فروغ برابر ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور کے ادبا پہلے سے زیادہ موضوعات کو زینتِ قرطاس بنا رہے ہیں کیوں کہ تمام تہذیبوں، انسانی وسائل و مسائل اور زندگی کے تمام موضوعات کو بیان کرنا آج کے دور کے تخلیق کار پر واجب ہو گیا ہے۔ آج کے دور کو سوشل میڈیا کا دور کہا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کے دور کا فرد تحریر پڑھنے کی بجائے متحرک تصویر یعنی ویڈیوز دیکھنے کا دل دادہ ہو چکا ہے۔ قارئین اب سامعین بلکہ ناظرین بن

عباس علی شاہ ثاقب

چکے ہیں۔ انسان قرطاس پر لکھی گئی چیزوں کو پڑھنے کی بجائے سکرین پر دیکھنے، سننے اور محظوظ ہونے کا عادی ہو چکا ہے۔ اس اجتماعی روش اور اس کے دوررس اثرات کا ادراک ہر ذی شعور انسان اور کتاب دوست کو لازماً رکھنا چاہیے تاکہ ہمارا کتاب سے رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔ ایسے دور میں ڈاکٹر رحمت علی شاد کا ''تحقیق و تخلیق'' کے عنوان سے مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آنا یقیناً ان کی علم دوستی اور تحقیقی مزاج کا عکس کر رہا ہے۔

ہم اس دین کے پیروکار ہیں جس کی تعلیم کا آغاز ہی ''اقرا'' سے ہوا ہے مگر شومئی قسمت کہ ہم مطالعہ اور کتاب سے کوسوں دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سوشل میڈیائی سرطان کے باعث دور حاضر کی خباثتوں کے باعث کتاب کے ساتھ ہمارا ناتا کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ صورت اس وقت مزید تشویش ناک محسوس ہوتی ہے جب اس ناسور کے حل کے لیے ہمارے پاس متبادل لائحہ عمل اور حل بھی نہیں ہے۔ ایسے وقت میں یہ بات خوش آئند اور اُمید افزا ہے کہ کتاب سے مجموعی سطح کی بے زاری کے باوجود بھی وطن عزیز پاکستان میں لکھنے والوں نے یہ اہم ترین محاذ سنبھال رکھا ہے۔ انھوں نے ملی تشخص کے ورثے کی حفاظت کے لیے اپنا تن من دھن وقف کر رکھا ہے اور تحقیق و تخلیق کا چراغ جلا کر فانوس کی طرح اس کی حفاظت بھی کر رہے ہیں۔ ان کے جلائے گئے قلیل چراغوں کی بہ دولت ہی تیرگی کا احساس کم ہو رہا ہے۔ ''تحقیق و تخلیق'' کے مضامین میں ادبی موضوعات پر مستند علمی و ادبی مباحث اور منظر نامے پر گہرے اثرات کو سامنے لایا گیا ہے۔ تصنیف ہذا میں شعرا اور ادبا کے کی فکری گہرائی و گیرائی اور تخلیقی کروٹوں کے بل سامنے لائے گئے ہیں۔ یوں ایک ادبی اثاثہ اب ادبی عہد کا روپ دھار چکا ہے۔ تخلیق اپنے خالق کے خدوخال اُجاگر کرتی ہے۔ ادبی کائنات کھوجنا اور معاصر عہد کے شعرا کی تخلیقات پر نقد و نظر کے تعلق سے قلم اٹھانا بازیافت کی کڑی ہے۔ عمومی طور پر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ تحقیق اور تخلیق دو ایسے اجزا ہیں جو ادبی ارتقا میں کلیدی نوعیت کا کردار ادا کرتے ہیں۔ تحقیق کی بہ دولت علم میں نمو و ارتقا اور نئی معلومات کا حصول ممکن ہوتا ہے اسی طرح تخلیق اس علم کو بروئے کار لاتے ہوئے نئی چیزیں پیدا کرنے کا عمل ہے۔ ادب کے تاج محل کی تعمیر میں دونوں گراں قدر اور بیش قیمت اجزا ہیں اور انھی سے ادب کی خوب صورتی و دل کشی دل آویز ہے۔ تحقیق کے بغیر تخلیق ناممکن ہے اور تخلیق کے بغیر تحقیق کا مقصد کامل نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر رحمت علی شاد شرف نگاہی سے کام

لینے والے نقاد ہیں۔ اس کتاب سے مصنف کی قابلِ قدر تحقیقی، تخلیقی صلاحیت اور ادب فہمی جلوہ افروز ہوئی ہے۔ ان کے رویّے کی پختگی اور تحقیق و تخلیق کی متنوع جہات کی پیش کش تحسین کے لائق ہے۔

ڈاکٹر رحمت علی شاد کا اسلوب بیان سادہ، پُرتاثیر اور قابلِ فہم ہے۔ ان کی نثر سادگی، بے ساختگی اور ارتباط و انسلاک کی خوبیوں سے مملو ہوتی ہے۔ یہی وصف فطری طرز بیان کا گل دستہ معلوم ہوتا ہے۔ علمی موشگافیوں اور گنجلک عبارتوں سے مضمون مکدر نہیں ہونے دیتے۔ مصنف اور قاری دونوں ہلکی طبیعت سے ایک دوسرے کو قبول کر لیتے ہیں۔ الفاظ کا عوامی لہجہ ہی شاد کے اسلوب بیان کا ایک خاصہ ہے۔ ان کی تحریر مؤثر، دلچسپ اور علمیت سے ثروت مند ہوتی ہے۔

اس کتاب کے مضامین کو درج ذیل عنوانات سے موسوم کیا گیا ہے۔

''شہر فرید کا تاریخی و تہذیبی پس منظر اور جدید شعری روایت''، ''دوسخن ذو بابیوی کے کلام میں متصوفانہ عناصر''، ''منیب برہانی کی شاعری کا فنی و فکری جائزہ'' ''سید واجد علی شاہ گیلانی کا شعری اسلوب'' ''شریف ساجد کے شعری شعور پر داغ دہلوی کے اثرات'' ''تائب نظامی کی شعری کائنات'' ''ایوب اختر کی غیر مطبوعہ تحریروں میں فنی و فکری تنوع'' ''یونس فریدی کی اردو غزل کے انفرادی خدوخال'' ''میاں محمد رفیق قیصر کی شخصیت اور اسلوب'' ''یاسر رضا آصف کی تخلیقی کاوشیں'' ''فیض احمد فیض کی حسیہ شاعری کا معنویاتی نظام'' ''تاریخ و تہذیب مغائرت اور اردو ادب کا باہمی رشتہ'' ''نوید عاجز کی شاعری میں فکری جہات اور فنی تجربات'' ''اظہر کمال کی شاعری میں عصری و سماجی شعور'' ''توانا لہجے اور نئے امکانات کا شاعر: شریف ساجد'' ''یونس متین کی شاعری کا فکری و فنی نظام'' ''مقدمات باغ و بہار: تنقیدی مباحث و تجزیاتی تقابل'' ''نئی صدی کے اردو ناولوں میں پاکستانیت'' ''کلام فیض کا علامتی و استعاراتی نظام'' ''کلام میر میں جذبہ عشق کے زیر اثر چند متضاد اور متلازم پہلوؤں کی نشاندہی'' ''کافکا اور منٹو کی تحریروں میں فکری اشتراکات'' ''اکیسویں صدی کی اردو غزل میں عصری معنویت''۔ اس طرح ڈاکٹر رحمت علی شاہ نے 22 مضامین لکھے ہیں جو بیشتر ریسرچ جرنل میں پبلش ہو چکے ہیں اور کچھ اشاعت کے مراحل میں ہیں مگر ان 22 آرٹیکلز کے علاوہ باقی آرٹیکلز کو ملایا جائے تو اب تک 34 ریسرچ آرٹیکلز لکھ چکے ہیں۔ اس بات سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر رحمت علی شاد نے اس کام کو بڑی تن دہی، جاں فشانی قلبی وارفتگی اور قلمی محنت شاقہ سے تکمیل آشنا کیا ہے۔ اس کتاب کو

حسن ادب فیصل آباد والوں نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر رحمت علی شاد نے اس کا دیباچہ "جادۂ شوق" کے عنوان سے لکھا ہے۔ جب کہ دیگر مضامین میں "چند باتیں" کے عنوان سے ڈاکٹر محمد افتخار شفیع نے مضمون لکھا ہے۔ "تحقیق و تخلیق: ایک تعارف" کے عنوان سے ڈاکٹر نوید عاجز نے مضمون لکھا ہے۔

تیسرا اور آخری مضمون "تحقیق و تخلیق: طائرانہ نظر" کے عنوان سے ڈاکٹر احمد علی انجم کا ہے۔ جب کہ دائیں اور بائیں اندرونی فلیپس پر ڈاکٹر رحمت علی شاد کی مطبوعہ کتب کے ٹائٹل صفحات چھاپے گئے ہیں۔

تحقیق و تخلیق و تنقید کے علاوہ ڈاکٹر رحمت علی شاد منتظم، پرنسپل اور خوب صورت لب و لہجے کے شاعر بھی ہیں۔ ان کی نو کتب جو مختلف اصناف ادب پر مشتمل ہیں شائع ہو چکی ہیں۔ پوری توانائی اور انتہائی بصیرت کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور بہت ساری کتب زیرِ ترتیب ہیں۔

"تحقیق و تخلیق" میں شامل کچھ مضامین کی بہ دولت پاک پتن کے معاصر ادب کا ایک عمیق جائزہ ہمارے سامنے آیا ہے۔

فکری زاویوں میں ارتقائی عمل کا اظہار بھی دیکھنے میں آیا ہے۔

تکوینی ارتقا، تخلیقی شعور اور ہیئتی تجربات کا تجزیاتی مطالعہ نمو پاتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تحقیق برتر عمل ہے اور اس کے بغیر تحقیق اور تنقید کے شعبے تکمیل آشنا نہیں ہوتے۔ تاہم تحقیق و تنقید سے مخفی رازہائے زندگی عیاں ہو جاتے ہیں۔ اظہار و اسلوب دراصل وہ ذاتی انفرادیت ہے جس کی بہ دولت ہم کسی مصنف کے مزاج اور اس کی فکری و نظریاتی و تحقیقی صلاحیتوں کو پہچان سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر رحمت علی شاد ایک روشن دماغ اور باصلاحیت محقق و نقاد ہے۔ آپ نہ صرف شعر و ادب کا مطالعہ نئے زاویوں سے کرتے ہیں بلکہ موضوعاتی و اسلوبیاتی اور تجزیاتی حوالوں سے بھی نادیدہ گوشوں کو اجالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ جب ان کے تنقیدی مضامین میری نظر سے گزرے تو وہ ان کی محققانہ اور ناقدانہ نظر کا ہی نہیں بلکہ متن سے اخذ معانی، تخلیقیات کی بازیافت اور فن پاروں کے لسانی، ادبی اور فکری پہلوؤں کے تجزیے کے حوالے سے دیدہ ریزی اور بصیرت مندی کی علامت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر رحمت علی شاد کا شمار اردو کے معتبر ناقدین میں ہوتا ہے۔ یہ کاوش یہاں دستاویزی اثاثہ ہے وہیں اسکالرز اور طلبا کے لیے ایک سنگِ میل بھی ثابت ہوگی۔

☆☆☆☆☆

اردو ناول نگاری میں ڈپٹی نذیر احمد کا کردار

دانیال حسن چغتائی

ادب انسانی معاشرے کی ضروریات کے درمیان جنم لیتا ہے اور یہ انسانی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ دنیا کا ہر ادب اسی انسانی زندگی کے حقائق کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اسی لیے ادب اور معاشرے کے درمیان مضبوط ربط اور تعلق ہے۔ ادب معاشرے کو متاثر کرتا ہے تو معاشرہ بھی ادب کا رخ متعین کرتا ہے۔ ہر ادب کی تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور مخصوص فضا اور ماحول میں وہ وجود پاتا ہے۔ اردو میں ناول نگاری کی روایت بھی کچھ اسی قبیل سے ہے۔ یوں تو یہ صنف سخن مغربی ادب سے اردو میں در آئی ہے لیکن یہاں پر فن ناول کو سازگار فضا اور ماحول نصیب ہوا جس کی وجہ سے بہت جلد اس نثری صنف سخن کو عروج حاصل ہوا۔

ناول اردو کی مقبول ترین نثری صنف ہے۔ یہ صنف سخن کچھ مخصوص عناصر پر مشتمل ہے اور اس صنف سخن میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مسائل کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ناول میں کبھی ملکی اور قومی مسائل کو جگہ دی گئی تو کبھی اجتماعیت اور انفرادیت کے مسائل کو الگ الگ پیش کیا گیا ہے۔ شہری زندگی اور دور دراز گاؤں اور دیہاتوں میں بسنے والی قوموں کے مسائل کو منظر عام پر لایا گیا۔ ناول غیر معمولی صنف سخن اس حیثیت سے بھی واقع ہوئی کہ اس میں ہر طرح کی مقامی وملکی تبدیلیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔

اردو میں بہت سارے ناول تصنیف کیے گئے اور آج تک لکھے جا رہے ہیں لیکن اس کا باقاعدہ آغاز ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات سے ہوتا ہے جس میں فن ناول کے عناصر کی شمولیت نظر آتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد تاریخ ادب اردو کی اہم اور مایہ ناز شخصیت ہے۔ ان کا شمار اردو کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ وہ مایہ ناز مصنف ہی نہیں بل کہ شعلہ بیاں مقرر بھی تھے۔ انھوں نے سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی تصنیفات کے ذریعے معاشرتی اصلاح کا کام لیا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اردو ادب کو سات ناول دیے ہیں جو مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، ابن الوقت، فسانہ مبتلا، ایامی اور رویائے صادقہ کی صورت میں ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اس وقت شعور کی آنکھیں کھولیں جب برصغیر غلامی کی زنجیر میں جکڑ چکا تھا۔ صدیوں سالہ مغل کی شاندار روایت اپنا وجود کھو رہی تھی۔ عالمگیر کے بعد اس عظیم

سلطنت کو سنبھالنے کے لیے کوئی لائق و فائق حکمران نہیں ملا- نتیجتاً غیر ملکی سامراجی قوتوں نے اپنا پنجہ استبداد جکڑ لیا اور دن بہ دن یہاں کی معاشی، معاشرتی اور تعلیمی صورت حال بد سے بدتر ہوتی گئی- تعلیم سے دوری کے سبب بہت سے سارے مدبرین و مفکرین کو تشویش ہوئی چنانچہ ہر میدان میں اس کی اصلاح کی کوشش کی گئی- ڈپٹی نذیر احمد نے ہندوستان کی اس زوال آمادہ تہذیب و ثقافت اور پوری طرح سے بگڑی ہوئی صورت حال کا اپنی نگاہ عمیق سے گہرا مشاہدہ و مطالعہ کیا تھا- ساتھ ہی ساتھ وہ ان مذکورہ بھی تحریکات کے اصول و ضوابط اور مقاصد سے پوری طرح واقف تھے اور خود ان کو اپنے اہل وطن خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم اور ان کے معاشرے کی اصلاح کی زبردست فکر تھی- اس طرح سے ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت پر ان کے عہد کی گہری چھاپ تھی جس کا اثر ان کے تقریباً سبھی ناولوں میں دیکھنے کو ملتا ہے- ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں مذہبی، سماجی، تہذیبی ہر طرح کی اصلاح کا پہلو نمایاں طور پر غالب ہے- قصے اور کہانی کے پیرائے میں وہ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان مذکورہ امور کی اصلاح کی بھرپور کوشش کرتے ہیں- اصلاح کے پیش نظر انھوں نے یہ ناول تصنیف کیے- معاشرے کی اصلاح کی شروعات کہاں سے ہو اور کیسے ہو ان سب پر ان کی بڑی گہری نظر تھی- وہ معاشرتی نفسیات سے پوری طرح باخبر تھے۔

چنانچہ اپنے ابتدائی ناولوں میں انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو موضوع بنایا- اور ان کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے متمنی ہوئے- اس سلسلہ میں ان کے دو ابتدائی ناول ''مراۃ العروس اور بنات النعش ہیں- مراۃ العروس میں بچیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے اخلاق و کردار کو سنوارنے پر زور دیا گیا ہے- انھوں نے اپنا یہ ناول خاص مقصد کے لیے تصنیف کیا- یہ ناول وقتاً فوقتاً مختلف مراحل میں اپنی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تصنیف کیا- ان کے اس ناول میں اصلاح کا پہلو غالب ہے- اس ناول کے ذریعہ انھوں نے بچیوں کو انتظامی امور کی تعلیم دی ہے-

ڈپٹی نذیر احمد کا دوسرا ناول بنات النعش ہے- یہ ناول پہلے ناول کا تکملہ ہے- پہلے ناول میں جو کردار آئے تھے ان میں کے کچھ کردار اس ناول میں بھی شامل ہیں- اس ناول میں انھوں نے پہلے ناول کے بالمقابل تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں دو قدم آگے بڑھ کر معلوماتی باتیں بیان کیں- اس طرح سے وہ نصابی نقطہ نظر سے تعلیم کے سلسلہ کو آگے بڑھا رہے ہیں- اس ناول میں انھوں نے مستورات کے لیے بہترین معاشرتی زندگی جینے کے ہنر سکھائے ہیں- تعلیم کی اہمیت و افادیت بیان کی ہے- مختلف نئے علوم و فنون کی ابتدائی اور بنیادی

باتوں کو واقعات کے پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن کو مکمل طور پر اپنانے کے نقصانات کو اجاگر کیا ہے۔ فن کی حیثیت سے اس مذکورہ ناول کے تعلق سے بہت سارے ناقدین نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ان کے اس ناول میں پلاٹ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ ناول خاص مقصد کے پیش نظر تحریر کیا تھا۔ جس کی وجہ سے فن پر مقصدیت غالب ہوگئی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا مشہور و معروف ناول توبۃ النصوح ہے۔ اس ناول کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ سے لے کر موجودہ عہد تک کے کئی بڑے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس ناول کا موضوع تربیت اولاد ہے۔ اولاد کی تربیت، مذہبی اصول و ضوابط کے دائرے میں ہونی چاہیے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ بچے کا ایمان و ایقان مضبوط ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ صالح اخلاق و کردار کا پیکر بنے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے اکثر ناول اسم بامسمی ہیں۔ یہ ناول بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ ناول کا نام انھوں نے قرآنی آیت کے ایک جزو سے منتخب کیا اور لفظ نصوح جو کہ خالص کے معنی میں مستعمل ہے اس لفظ کو انھوں نے ناول کا ایک کردار بنایا اور اس کردار کی توبہ کو واقعہ کے پیرائے میں بیان کیا۔ نصوح گھر کا مالک ہے اور اس کی زندگی عام روش پر چل رہی تھی کہ ایک خواب نے اس کی زندگی کے اندر انقلاب برپا کر دیا۔ جس کے بعد وہ خود راہ راست پر آیا اور مذہب کا پابند ہوتے ہوئے اس پر کاربند رہا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کا متمنی ہوا۔ اس اولاد میں جو ابھی سن صغر میں تھے اور شعور میں پختگی نہیں آئی تھی ان پر تو نصوح کی تربیت کا اثر صاف طور پر دکھنے لگا لیکن اس کا بڑا بیٹا کلیم جو پختگی عمر کو پہنچ چکا تھا اس پر اس کی تربیت کا اثر نہ پڑا بل کہ اس پر نصوح کی تربیت گراں گذری اور وہ خود اپنے والدین کے گھر سے سکونت ترک کر کے کہیں اور جائے پناہ تلاش کر لی۔ ناول کا نام توبۃ النصوح خود میں ایک پرکشش اور جامع معنی لیے ہوئے ہے۔ اس مذکورہ ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے فن ناول کے اجزائے ترکیبی مثلاً کردار نگاری، مکالمہ نگاری وغیرہ کو کام میں لاتے ہوئے قصے پن کو آگے بڑھایا ہے۔ ناول میں جگہ جگہ اپنی بات کے دلائل و شواہد میں قرآنی آیات، احادیث اور عربی فقروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی قصے کی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آ رہا ہے جو ڈپٹی صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

نذیر احمد کا چوتھا ناول فسانہ مبتلا ہے۔ اس ناول میں بھی انھوں نے مسلم معاشرت کے اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ ہے تعدد ازدواج یعنی ایک سے زیادہ شادیاں

کرنا۔ تعدد ازدواج کو شریعت مطہرہ نے گرچہ کہ مباح و جائز قرار دیا اور خود ڈپٹی موصوف کی بھی دو شادیاں تھیں لیکن فکری طور پر ڈپٹی نذیر احمد بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور وہ اس کو سماجی برائی کے روپ میں دیکھتے تھے کیوں کہ ایک سے زائد شادی کی صورت میں گھر میں تناؤ اور تربیت اولاد کے متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔ وہ تعدد ازدواج کے مخالف اس وجہ سے تھے کہ ان کا عہد، ماحول اور اس عہد کی مسلم معاشرہ کی طرز زندگی اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اور شریعت نے بھی تعدد ازدواج کو ہر حالت میں مباح نہیں رکھا ہے بل کہ حالات و کوائف پر اس کے جواز کو موقوف رکھا ہے۔ وہ کم عمری میں شادی کے رواج کو بھی بند کرنے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔

ابن الوقت نذیر احمد کا ایک اہم ناول ہے جس میں ان کے عہد کے سماج کا پس منظر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس میں دو متضاد تہذیبوں کی کشمکش کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اس سلسلے میں خود انہوں نے اپنا مطمح نظر پیش کیا ہے کہ مغرب کی کورانہ تقلید سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن بالکل ہی اس کو شجر ممنوعہ قرار دیتے ہوئے اس سے دوری پیدا کرنا بھی درست نہیں بلکہ مثبت انداز میں مغرب کا انداز فکر اور اس کی ان تہذیبوں کو اپنا لینے میں کوئی حرج نہیں جس سے کہ منفی اثرات مرتب نہ ہوتے ہوں۔ اسی طرح سے وہ مشرقی اقدار و روایات کے حامی اور پاسدار ہوتے ہوئے بھی کلی طور پر اس کو اپنا لینے نیز اس میں اپنے مستقبل کی ترقی کا راز ڈھونڈنے کے مخالف نظر آتے ہیں۔ بلکہ مشرق و مغرب کی صالح اقدار، انداز فکر اور مثبت طریقہ کار اپنا کر مستقبل کی زندگی کو روشن اور تابناک بنانے کے حق میں تھے۔ اس مذکورہ ناول میں ابن الوقت کا کردار اہم ہے جو مغربی تہذیب و تمدن کا دلدادہ ہے اور مفاد خویش کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہے جب کہ اس کردار کے مدمقابل اور اس کا متضاد کردار حجتہ الاسلام ہے۔ ان دونوں کے مابین اکثر مکالمہ کے ذریعہ دونوں تہذیبوں کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں حجتہ الاسلام کا کردار نہایت سلجھے ہوئے انداز میں دلائل و براہین کی روشنی میں ابن الوقت کی باتوں کا جواب دیتا ہے اور اس کے طرز فکر کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اس ناول کے یہ دونوں کردار بھی یعنی ابن الوقت اور حجتہ الاسلام اسم بامسمی ہیں جو الگ طرح کا لطف پیدا کرتے ہیں۔ فن کے اعتبار سے ان کا یہ ناول ماقبل کے ناولوں سے آگے ہے۔ اس ناول میں ڈپٹی موصوف کا شعور اور فن دونوں ابھر کر سامنے آیا ہے اور اس ناول نے اردو ناول نگاری کو بہت حد تک فن ناول سے قریب کر دیا ہے۔۔

☆☆☆☆☆

فکشن، جدید فکشن، مابعد جدید فکشن ــــ کچھ باتیں

سید تحسین گیلانی

جب کوئی بھی ناقد افسانے کے عدم ارتقا کا یا زوال کی بات کرتا ہے تو شاید وہ خود کو محدود دائرے میں سمیٹ لیتا ہے ہاں اگر وہ یہ بات کرے کے موضوعات آگے نہیں بڑھ رہے ہمارا تخلیق کار ایک خاص قسم کے افسانوی حصار میں قید ہو کر رہ گیا ہے تو بات کسی حد تک صائب ہو گی- یہ نہیں کہ افسانہ لکھا نہیں جا رہا لیکن وہ کس حد تک حقیقت کا بیانیہ ہے اور کس حد تک علامتی اور مجرد ہے اور کس حد تک فکشن جدید و مابعد جدیت کی جانب بڑھا یا اہم ہے-

ادب میں نظم ہو غزل ہو یا افسانہ/ ناول (فکشن) تجربے کو اس میں خاص اہمیت حاصل ہے ہمارا ادیب اصناف_ادب میں تجربات سے خود کو دور کھینچتا ہے ایک ہی قسم کے موضوعات ایک پیٹرن ایک ہی انداز میں افسانوی ادب کی ایک کثیر تعداد نے کم از کم مجھے بہت مایوس کیا عورت کا مسئلہ تیسری دنیا کے اہم مسائل میں سے ایک ہے- بلاشبہ عصمت/ منٹو/ واجدہ تبسم اور دیگر کئی فسوں گروں نے ان موضوعات پر جم کر لکھا اور ایک خاص جنسی تڑکے سے انھوں نے خاص قسم کے قارئین کو متوجہ بھی کیا- لیکن بات وہیں کہیں رک کر رہ گئی- بہت سے لکھنے والے اس وقت ایک خاص دائرے میں گھوم رہے ہیں اور جدت منہا ہوتی گئی-

لیکن ساتھ ہی کچھ نام ایسے بھی آئے جنھوں نے خود کو نئی راہ پر ڈالا جن میں بلراج کومل، جوگندر پال، سریندر پرکاش، کلام حیدری، رشید امجد، منشا یاد، انتظار حسین، مرزا حامد بیگ، احمد یوسف، قمر احسن، مظہر الزماں خاں، شمویل احمد، اسد محمد خاں، محمد الیاس، ابدال بیلا، عذرا اصغر اور کچھ نام بھول رہا ہوں، نے جدید افسانے کی جانب قدم بڑھائے اور علامت و حقیقت کے امتزاج سے کئی عمدہ مثالیں بھی پیش کی تو اب یہ سوال اہم ہو گا کہ

مابعد جدید بیانیہ کیا ہے؟

تو مختصر عرض کروں گا،

سب سے اہم نکتہ یہ کہ

* مابعد جدید تخلیق کار کا یہی ہے کہ وہ مکمل ذہنی آزادی کا قائل ہوتا ہے وہ کسی طے شدہ فارمولے یا طے شدہ فکر سے الگ کر کے خود کو خالص تخلیق سے جوڑتا ہے-

* مابعد جدید فکر میں تجرید علامت اساطیر فنتاسی اسراریت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری سے بھی ہاتھ ملانا لازم ہے-

اور سب سے اہم بات

* مابعد جدید post Modernish
تخلیق کار یا سخت کی فضا سے نکلتا ہوا نئے ثقافتی اور سماجی ڈسکورس میں شمولیت کا اعلان کرتا ہے۔
اس وقت سوشل میڈیا پر ادبی فورمز قاری و تخلیق کار کی تربیت میں اہم ترین کردار ادا کر رہا ہے ہمارے ہاں افسانہ کثیر تعداد میں لکھا جا رہا ہے جو کہ خوش آئند بات ہے لیکن کیا اچھا افسانہ لکھا جا رہا ہے کیا جدید بیانیہ سامنے آ رہا ہے یا گھسے پٹے سستے Love / رنڈی / مولوی کی کہانیاں ہی سامنے آ رہی ہیں وہ بھی اکہرے بیانیے کے ساتھ جس میں سطحی لسانی دھاک بٹھا کر قاری کے ذہن سے کھیل کر اسے بے سمت کیا جا رہا ہے اس پر توجہ کی خاص ضرورت ہے۔ حال ہی میں سوشل میڈیا پر عالمی افسانہ نشست میں کچھ بہت عمدہ تخلیقی بیانیے نظر آئے جنھوں نے اردو افسانے کا کے مستقبل پر پڑی دھند کو کسی حد تک دور کیا۔
نئے افسانہ نگار کو کرنا کیا ہے کہ اسے اسلوب کے نئے نئے سانچوں کو تراشنا ہے خود کو نئے زمانے کے فریم میں رکھتے ہوئے نئی تمثیلی تجریدی و علامتی فن سے بھی آشنا کرنا ہے اور حقیقت کا ہاتھ بھی تھامے رکھنا ہے۔ عرفان فن کے لیے مطالعہ سب سے اہم ہے بجائے ابتدا میں علامت و تجرید کے ادق تجربے نہ کریں لیکن حقیقت کی تہہ دار کیفیت تک رسائی کا اہتمام ضرور کریں وہ اہتمام ان کی انگلی تھام کر خود ہی جدید بیانیے کے دیار تک لے چلے گا۔
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ایک اہم جملہ یاد آ گیا کہ:
''فکشن کتنا ہی تجریدی و علامتی ہی کیوں نہ ہو اسے کہیں نہ کہیں پیر ٹکانے پڑ ہی جاتے ہیں۔''
انتظار حسین کے خوب صورت جملوں پر بات ختم کروں گا اس یقین کے ساتھ کہ ہمارا جدید فکشن نگار نئی فکر اور نئے تجربات کے ساتھ افسانے کو آگے بڑھائے گا اور یہ کارواں یوں ہی ایک خوش گوار امید کے سائے تلے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔
ایک ادبی مکالمے میں انتظار حسین فرماتے ہیں کہ:
''لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی اردو گرد وافر مقدار میں برا لکھا جا رہا ہو تب بھی اچھا بھی لکھا جاتا ہے۔ با معنی اظہار کہیں الگ طاق میں رکھا ہوا نہیں ہوتا کہ لکھنے والا بس ہاتھ بڑھائے اور اسے مٹھی میں لے لے۔ روایتی ادب بے معنویت سے پاک ہوتا ہے مگر اس کی معنویت مشکوک ہوتی ہے۔ نئے اظہار کی صورت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ بے معنویت کا ایک جنگل آگ آتا ہے یہ ہی با معنی اظہار اس کے بیچ میں سے برآمد ہوتا ہے۔''

☆☆☆☆☆

مظہر امام کی نعت نگاری [حرفِ ابتدا]

نعت محسنِ کائنات، شافعِ محشر، فخرِ موجودات، رحمتِ عالم، سرورِ دو جہاں، سرورِ عالم، خاتم النبیین، صاحبِ لولاک، صاحبِ خلقِ عظیم، مجسم تفسیر القرآن حکیم، پیکرِ انوارِ تجلیات، نورِ کائنات، حضور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت و محبت کو شعری صورت میں ہدیہ تبریک پیش کرنے کی ایک منفرد صورت ہے جو کہ خود کوشش سے کہیں زیادہ عطا ہونے سے تعلق رکھتی ہے۔ نعت عطا ہوتی اور تب عطا ہوتی ہے جب بندہ عقیدت و ارادت کی کیفیت سے سرشار ہو کر خالصتاً حضور پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق میں اپنے خیالات و جذبات کو شعری صورت میں رقم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ کو بیان کرنے کے لیے شعرا کرام اپنے اپنے انداز سے صدیوں سے نعت کی صنف میں عقیدت کے پھول نچھاور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حضور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و عقیدت کا یہ سلسلہ مسلمان شعرا تک ہی محدود نہیں رہا، بہت سے غیر مسلم شعرا نے بھی حضور سے اپنی غیر مشروط محبت کا اظہار اپنی نعتیہ شاعری میں بھی کیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضور پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف و توصیف کرنا عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ نعت چونکہ خالص عطا کا معاملہ ہے اور یہ عطا اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں پر ہوتی ہے، یوں تو مظہر امام نے تقریباً تمام شعری اصناف میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا لیکن ان کی نعت نگاری ہر لحاظ سے متاثر کن رہی، انھوں نے حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی عقیدت کو منفرد اسلوب سے بیان کیا کہ مظہر امام کی نعت پڑھتے ہوئے جذب و مستی کی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے جو قاری کو تا دیر اپنے روحانی حصار میں لیے رکھتی ہے۔ مظہر امام آج کل امریکہ میں مقیم ہیں لیکن لاہور اور لائل پور (اب فیصل آباد) کے ادبی حلقوں سے ان کی وابستگی کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے، سرکاری ملازمت کی مصروفیات نے ان کو ادبی حلقوں سے دور کر دیا لیکن انھوں نے اپنی مٹی سے اپنے لوگوں سے، اپنے چاہنے والوں سے اپنے پُرخلوص اور بے غرض تعلق کو قائم رکھا

افتخار شوکت

ہے، مظہر امام کا بنیادی تعلق ننکانہ صاحب کے گاؤں گاندراں سے ہے، ابتدائی تعلیم کا سلسلہ یہیں سے آغاز ہوا بعد ازاں فیصل آباد میں کالج لائف کا عرصہ گزرا اور اسی دوران مظہر امام کا ادبی ذوق پروان چڑھنا شروع ہوا- 70 کی دہائی میں شعری تخلیقات کی اشاعت ہوئی، تعلیم مکمل ہونے کے بعد سرکاری ملازمت کا آغاز ہوگیا اور ادبی دنیا سے تعلق تعطل کا شکار ہوگیا، لیکن اردو ادب سے محبت قائم رہی اور اپنا پہلا شعری مجموعہ شہر وجدان 2017 میں شائع کیا بعد ازاں اس کا دوسرا ایڈیشن 2025 شائع ہوا- مظہر امام نے مستعمل اور متروک بحروں میں بھی شعری تجربات کیے- 2025 ربیع اول کے مبارک مہینے میں انکا اولیں نعتیہ شعری مجموعہ ”حرفِ التجا“ شائع ہوا، جس کی اشاعت و طباعت میں ملک کے ممتاز شاعر و ادیب، ثنا خوان مصطفیٰ جناب علی رضا اور معروف شاعر زاہد شمس نے کلیدی کردار ادا کیا اور یوں قارئین کو ”حرفِ التجا“ کی صورت میں خوب صورت نعتیہ شعری مجموعے کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا- حرفِ التجا، کو پاکستان کے ادبی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی حاصل ہو رہی ہے، آپ بھی مظہر امام کے نعتیہ کلام کے منتخب اشعار کا عقیدت و احترام سے مطالعہ فرمائیں-

نعت کے سائباں میں زندہ ہوں
خوشبوؤں کے جہاں میں زندہ ہوں

جب سے نعت ان کی لکھ رہا ہوں میں
اپنے حرف و بیاں میں زندہ ہوں

ہوا ہوں آپ کا جس دن سے دنیا
مرے دل سے اُترتی جا رہی ہے

ہر گھڑی رکھتی ہے سرشار مجھے
نسبتِ سید ابرار مجھے

میری سوچیں بھی منور ہو جائیں
ہوں عطا نعت کے اشعار مجھے

اسی نسبت سے ملے عزت و توقیر مجھے
حشر میں آپؐ کی مدحت مری پہچان بنے

دل کو تسکین میسر ہے تیری چاہت سے
میں زمانے میں معزز ہوں تری نسبت سے

انؐ کے حضور جا کر یارو خیال رکھنا
مت مجھ کو بھول جانا میرا سلام کہنا

ہے دعا دل کی ختم ہو جائے
زندگی کا سفر مدینے میں

کیسے خوش بخت ہیں وہ لوگ امام
جن کا ہے مستقر مدینے میں

جب میں اس در پہ باریاب ہوا
ایک ذرے سے آفتاب ہوا

لطف سرکار کائنات امام
مجھ سے عاصی پہ بے حساب ہوا

☆☆☆☆☆

اردو ادب، خاص طور پر شاعری میں، مزاحمتی و علامتی عناصر: اسباب، ارتقا اور مضمرات

مزاحمت زندگی کی علامت ہے اور زندگی ادب کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ سو منطقِ استخراجیہ کے مطابق مزاحمت اور ادب میں براہ راست اور بالواسطہ رشتہ مسلّمہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مزاحمت کی بنیاد ابلیس نے رکھی جب اس نے حکمِ الٰہی کیسامنے حجت بازی کی۔ پھر بھی ابلیس شیطان کہلایا جب اس نے حضرت آدم کے خمیر میں خفتہ مزاحمتی عنصر کو اپنی مکاری سے بیدار کیا۔ اسی لیے اقبال نے ابلیسی فطرت کو بہت عمدگی سے ابلیس کے حضرت جبرائیل کے ساتھ ایک مکالمے میں منظوم کیا ہے:

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مزاحمت سے مراد کون سی مزاحمت ہے۔ ظاہر ہے اس کی کچھ اقسام ہیں، جیسے فکری مزاحمت جس کا تعلق فرسودگی اور روایت پسندی کے خلاف اظہارِ فکر ہے۔ اسی طرح سماجی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی مزاحمت بھی اسی قبیل میں شمار ہوں گی۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ دیگر تمام اقسام کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور فکری و سیاسی مزاحمت سے ہی ہے، یعنی:

جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

....

میری اس تحریر میں بیشتر سیاسی مزاحمت کا تذکرہ ہی ہو گا کہ اس مزاحمت سے معاشروں میں بڑی اور مثبت تبدیلیوں کی راہ ہموار ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بغور اور مفصل انداز میں دیکھا جائے تو عالمی ادب میں متعدد شعرا نے ابلیس کو اسی بنا پر مزاحمت کے حوالے سے موضوعِ سخن بنایا۔

افتخار الحق

میں اسے محض اتفاق نہیں گردانتا کہ کلاسیکی اردو شاعری میں مزاحمت کم از کم باقاعدہ تحریک کی شکل میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ولی دکنی سے میر تک شاید شعرا کو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ اکثر شاعری سمیت تمام فنونِ لطیفہ کو سرکاری سرپرستی کسی نہ کسی صورت حاصل تھی۔ دبستانِ دلّی کی بات کریں تو بڑے بڑے شعرا کے ہاں مزاحمت کا یہ تصور تقریباً مفقود ہے۔ میر تقی میر نے البتہ مغلوں کے زوال کا مشاہدہ ضرور کرنا شروع کیا تھا جو 1707 میں اورنگزیب کی وفات کے بعد سے نسبتاً واضح طور پر شروع ہو چکا تھا۔ میر اور ان کے ہم عصر اور متاخرین کے ہاں مزاحمت کے بجائے احساسِ زیاں اور اس سے منسلک نوحے کا سماں جابجا نظر آتا ہے:

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے تب نہیں آتا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

....

آخری شعر میں لفظ "دل" کو وسیع تر معنوی تناظر میں دیکھنا بہت اہم اور ضروری ہے کیونکہ اس سے مراد مسلمانوں کا اجتماعی انحطاط ہے جسے اس دور کے صاحبِ فکر و نظر اہلِ قلم ہی دیکھ پائے ورنہ عوام میں اتنی دور اندیشی ہوتی تو جنوبی ہند کی تاریخ بہت مختلف لکھی جاتی تھی۔ میرزا رفیع سودا کے ہاں کچھ ایسا ہی منظرنامہ قدرے مختلف انداز میں ملتا ہے جب وہ آگہی اور اس کے اظہار سے وابستہ مسائل کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

سودا جو بے خبر ہے وہی یاں کرے ہے عیش
مشکل بہت ہے ان کو جو رکھتے ہیں آگہی

....

مومن کے ہاں معاملہ بندی کے پردے میں بالواسطہ اسی ماتم، بےبسی اور نوحے کا سامان بہم ہوتا نظر آتا ہے:

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

....

دبستانِ دلّی کا نقطۂ عروج اور کلاسیکی اردو شاعری کے ایک بہت بڑے باب کا اختتام غالب کی شاعری کی شکل میں ہوتا ہے۔ غالب کے ہاں بھی "دو شاہ کو دعا" اور "تم سلامت رہو ہزار برس" کی صورت مزاحمت سے انحراف کا رویہ بہت نمایاں

ہے - البتہ کئی اشعار میں وہ تیزی سے بدلتے سیاسی منظرنامے کی بات اپنے ان اشعار میں ضرور کرتے ہیں جن میں ذاتی کرب اور بیچارگی کی شدت کا بیان ہو:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

....

غالب کے اشعار میں چونکہ آفاقیت ایک واضح تر امر ہے تو ان کے کئی اشعار میں ہلکی ہلکی مزاحمت کی آنچ محسوس کی جا سکتی ہے:

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

....

یہاں زندگی، مرگ کا کھٹکا اور اڑنے سے پیشتر کی علامتیں بہت معنی خیز ہیں- یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اپنے یادگار خطوط میں بھی غالب نے معاصرین کی طرح جنگِ آزادی کے آس پاس کے واقعات کی دلخراش تصویر تو پیش کی ہے لیکن ان میں احتجاج کی جھلک بھی نہیں- شاید جنگ کے بعد محکمۂ ڈاک کی پابندیاں حائل رہی ہوں-

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے قدم ہوئے

....

اس شعر میں اسی درد کی طرف اشارہ ہے جو کسی بھی حساس تخلیق کار کو اپنے ماحول کو اپنی مرضی کے برعکس بدلتا ہوا دیکھ کر ہوتا ہے- ساتھ ہی اپنی قوم کی اجتماعی بے حسی اور بے بسی پر طنز کی کاٹ بھی محسوس کی جا سکتی ہے 1857 کی جنگِ آزادی نے تو متحدہ ہندوستان کا سیاسی چہرہ ہی اس طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا کہ اسی تناظر میں حالی نے یہ معنی خیز پیغام دیا تھا:

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

....

اس سے پہلے کہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے قصرِ مزاحمت میں قدم رکھا جائے، کچھ بات لکھنوی طرزِ سخن کی کرنا ضروری ہے- لکھنؤ میں عمومی خوشحالی کے متوازی ابھرتی ہوئی بے فکری اور عیاشی نے وہاں کی شاعری میں سوقیانہ اور بڑی حد تک فحش طرزِ اظہار کے رنگ بھرنے شروع کر دیے تھے- حیدر علی آتش، مصحفی اور معدودے شعرا کے استثنا کے ساتھ وہاں ایسی ہی تہذیب و سخنوری کے رجحانات پروان چڑھ رہے تھے جن سے قوموں کے زوال کے اسباب کی تفہیم ممکن ہوتی ہے- نثر نگاری میں "شطرنج کے کھلاڑی" جیسے افسانوں سے اس کا بخوبی ادراک ہوتا ہے کہ ایسے ماحول میں

مزاحمت اور بغاوت جیسے عناصر شعر وسخن میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتے تھے۔ سو لامحالہ بیشتر لکھنوی شاعری میں ابہام، رمز اور کنائے کی اگر گرہیں کھولیں تو اکثر محبت کے جسمانی پہلو اور بسا اوقات کافی نچلی سطح کے سوقیانہ اسلوب کا سامنا ہوتا ہے۔ دلیل کے لیے چند امثلہ کافی ہیں:

دفعتاً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے
الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

جس طرف بیٹھتے تھے وصل میں آپ
اسی پہلو میں درد رہتا ہے

وہ انچا کے ہیں نازک میں سخت جاں ہوں کمال
عجب طرح کی مصیبت پڑی ہے خنجر پر

....

تاہم اہم بات یہ ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ دلّی میں اس رنگِ سخن کا رواج یکسر ہی متروک یا عنقا تھا۔ داغ اور مومن جیسے چوٹی کے اساتذہ نے بھی اسی گنگا میں حسبِ توفیق ہاتھ دھوئے لیکن ''موازنہ دلّی و لکھنو'' الگ سے ایک بہت بڑا موضوع ہے جس پر بہت کام ہو بھی چکا اور شاید ہوتا بھی رہے گا۔

اس اجتماعی تغافل کی سب سے بڑی وجہ تو صدیوں پر محیط ''پدرم سلطان بود'' کی روش اور طرز فکر ہے کہ عرصۂ دراز سے امن، خوشحالی اور اشرافیہ ماحول سے لبریز فضا کے بعد اہلِ قلم کو بروقت ادراک ہی نہ ہو سکا کہ سیاسی منظرنامہ کتنے زبردست انداز میں لیکن ایک پراسرار خاموشی کے ساتھ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ حکمران، عوام اور لکھاری ''یحسب انّ مالہٗ اخلدہ'' کے مصداق یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ انکا سکون دائمی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اور اظہار تو محمد شاہ رنگیلے کے عطا کردہ تاریخی جملے میں دکھائی دیتا ہے جو اب ایک تلخ یاد کی صورت محاوراتی پیرہن اپنا چکا ہے:

ہنوز دلّی دور است

یہ بات البتہ اپنی جگہ ایک معمہ ہے کہ شاعر اور ادیب تو کہیں زیادہ حساس ہوتے ہیں، پھر وہ بھی اسی عمومی تجاہلِ مجرمانہ کا عام آدمی کی طرح شکار کیوں رہے۔ شاید اس لیے کہ جنوبی ایشیا کا تاریخی طور پر مزاج مفاہمت پسند اور لچک دار رہا ہے۔ شمال مغربی ہندوستانی سرحد سے پے در پے حملہ آوروں کی یلغار جب ساحلی علاقوں سے گورے تاجروں کے بھیس میں آئی تو یہاں کے لوگ پہلے تو اس نہایت پیچیدہ کو سمجھ ہی نہ پائے اور جب کچھ ادراک کی فضا قائم ہوئی تو 1750 سے برصغیر کے مختلف خطوں پر

شاطرانہ قبضے کرتے کرتے فرنگ نے جب 1780 میں شروع ہونے والے صنعتی انقلاب کا نشہ چکھتے ہوئے ہندوستان کے ایوان ہائے اقتدار میں جھومنا شروع کیا تو سیاسی چال بازی میں جدید اسلحے سے لیس مہرے بھی استعمال کرنے لگے۔ پھر "تقسیم کرکے محکوم بناؤ" کا کشتہ بھی اپنا اثر دکھانے لگا لیکن سادہ لوح اور آپس میں دست و گریباں ہونے کو ہمہ وقت تیار رہنے والے مختلف ہندوستانی گروہ بساط الٹتی دیکھ کر بھی اسی خوش فہمی کا شکار رہے:

میں اپنی فتح سمجھتا تھا مات ہونے تک

اسی ضمن میں ایک اور پہیلی بھی کسی سے نہیں بوجھی جاتی کہ یورپ کے صنعتی انقلاب کی پرچھائیں تک برصغیر کے خلاق اذہان پر کیوں پڑ سکی۔ یہاں مغل دور میں فنونِ لطیفہ اور تعمیرات میں تو بہت نام بنایا لیکن جدید صنعتی ایجادات کی طرف یہاں کے اختراعی اہلِ قلم نے بالکل ہی توجہ کیوں نہ دی۔ ممکن ہے اگر ایسا ہوا ہوتا تو نوآبادیاتی حکمرانوں کے ہتھکنڈے انھیں سمجھ میں آنے لگتے۔ بیسویں صدی میں جا کر اقبال نے بھی مشینی طرزِ زندگی کو ہدفِ تنقید بنانے پر ہی اکتفا نہ کیا بل کہ کافی کھل کر مزاحمت کا اظہار کیا جس کا ذکر آئندہ سطور میں ہوگا۔

پھر جب بیداری کی کچھ لہر سی چلنا شروع ہوئی تو اس وقت جب 1857 کے سانحے کی صورت نوآبادیاتی حکومت باقاعدہ اپنا آپ منوا چکی تھی۔ گویا یوں سمجھیے کہ 1860 کے بعد سے علی گڑھ تحریک نے اصلاحی اور کلیتاً مدافعانہ طرز کے ادب کو فوقیت دی اور اس کی داغ بیل ڈالی جس کے اپنے تئیں کئی توجیہات و جواز پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن جس کے نتائج مزاحمت کا تریاق نکلے۔ لے دے کر اکبر الٰہ آبادی اور بڑی حد تک اقبال کی طنزیہ شاعری میں چھپا ہوا مزاحمتی رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ اکبر کے یہ اشعار دیکھیے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

خیر ایک وقت آیا کہ اکبر بھی سرسید کے اصلاحی دبستان کی حمایت پر مجبور ہوئے۔ اس طرح کسی منظم مزاحمتی تحریک کے امکانات عنقا ہونے لگے۔

اقبال نے چونکہ یورپ کا دورہ اس

دور میں کیا جب انقلاب روس (1905-1917) کے لیے زمین تیار کی جارہی تھی اور انھوں نے مغربی استعماری و نوآبادیاتی نظام کا قریب سے مشاہدہ کرلیا تھا، اس لیے انکی شاعری میں مزاحمتی عنصر کا نمایاں ہونا فطری تھا۔ ان کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مزاحمت کے ساتھ امید کا پیغام بھی دیتے ہیں تاکہ مزاحمت کے اگلے مرحلے کی جانب توجہ کی جائے۔ اس ضمن میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر ان کا یہ امید بھرا پیغام بہت اہم ہے:

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

....

مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی رویوں کے جواب میں اقبال نے یہ کہا:

حکمِ حق ہے "لیس للانسان الا ما سعیٰ"
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا حق سرمایہ دار

....

اقبال کی شکوہ، جوابِ شکوہ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اور قرطبہ کی جامع مسجد وہ شہکار نظمیں ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے پہلے نصف میں باقاعدہ مزاحمتی ادبی تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے معاصرین میں محمد علی جوہر اور ظفر علی خان نے پیروی اقبال کی روش میں کچھ مزید قدم اٹھائے لیکن اقبال کا ادبی قد بہت زیادہ بلند ہونے کے باعث مزاحمتی شعرا کی کوئی باقاعدہ جماعت نہ تیار ہوسکی۔

دوسری جنگِ عظیم کے زمانے نے اقبال کو الوداع کہتے ہوئے فیض کو میدانِ مزاحمت میں خوش آمدید کہا۔ فیض ان خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جنھیں ابتدا سے ہی پذیرائی ملنا شروع ہوئی۔ فیض کی شاعری، خاص طور پر نظموں کے پروقار اور گونج دار آہنگ نے گویا اقبال کی شاعری سے مرتعش دریائے سخن میں واضح ہلچل پیدا کردی:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

....

فیض نے مزاحمت کے لیے دلکش اور پرتاثیر

استعارے تخلیق کیے جن میں محتسب، منصف اور چارہ گر وغیرہ نمایاں ہیں۔ تاہم متعدد مقامات پر انھوں نے بین السطور مزاحمت خوب صورتی سے منظوم کی:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

....

یہ مصرعے اور اشعار اردو شاعری کی تاریخ میں ایک تو نئے تھے، پھر ان کا گرجدار اور تحریک دینے والا لہجہ اور ملکی سیاسی منظرنامے اور صورت حال، ان سب کے امتزاج نے فیض کو کماحقہٗ شہرت دی کہ ایسا پرزور مزاحمت آمیز طرزِ سخن پہلے اردو شاعری میں کہیں نہیں دیکھا گیا تھا۔ فیض نے گویا اقبال کی خودی، شاہین، گلِ لالہ، مردِ مومن اور بندۂ صحرائی کی تفاسیر ہی اپنی شاعری میں اپنے مخصوص رنگ میں پیش کر دیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہی ترقی پسند تحریک نے بھی جنم لیا لیکن کچھ عرصے بعد اس کے بانیوں کی باہمی چپقلش نے اسے اس کے مخالفین نے زیادہ نقصان پہنچایا۔ بایں ہمہ اس تحریک کو مزاحمتی تحریک کی تاریخ میں شامل کرنا ناگزیر بھی ہے اور منصفانہ بھی۔

فیض سے پہلے میراجی نے جدید اردو نظم میں اپنا مقام بنا لیا تھا لیکن میراجی کی نظموں میں علامتی نظام اتنا گنجلک اور جدید تر اسلوب میں ہے کہ راست بیانیہ کہیں کہیں ملتا ہے۔ متن۔ اساس تفہیم کے کلیے کو اپنا کر ان کی نظموں میں شدید طنز آمیز مزاحمتی رویے کے اظہار سے پرتیں اٹھا کر معنوی جھلک دکھائی دیتی ہے، جیسے:

خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے
سمٹے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ نورِ ازل مٹ چکا ہے

....

مجید امجد کی شاعری میں البتہ مزاحمتی رنگ بہت نمایاں اور اجلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں سماجی و معاشی مسائل پر نشتر رکھ کر معاشرے سے سوال بھی کرتی ہیں اور جھنجھوڑتی بھی ہیں۔

ایک نظم "جاروب کش" کا اقتباس کافی ہے:

تو اگر چاہے تو ان تلخ سیہ راہوں پر
جابجا اتنی تڑپتی ہوئی دنیاؤں میں

....

اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ انھیں تیری حیات
قوتِ یک شب کے تقدس میں سمو سکتی ہے

کاش تو حیلۂ جاروب کے پر نوچ سکے
کاش تو سوچ سکے سوچ سکے

اسی دور میں اختر الایمان کی نظموں میں بھی مزاحمتی پہلو پر بہت بات کی گئی۔ ان کی کئی نظموں میں شکایت واحتجاج آمیز رنگِ سخن انھیں مزاحمتی شاعری کی صفِ اول میں لے آتا ہے۔ خدا سے ان کے شکوے کا رنگ کچھ یوں ہے:

مگر مجھے کیا دیا یہ تو نے
شباب اک زہر میں بجھا کر

مجید امجد کا جاروب کش اور اختر الایمان کا واحد متکلم معاشرے کے استحصال زدہ ، کمزور اور مظلوم لوگوں کے ترجمان ہیں جن کا استحصال کوئی طبقاتی نظام کے تحت کرتا ہے تو کوئی مذہب کے نام پر۔

فیض کے ساتھ کافی شہرت پانے والے احمد فراز نے فیض ہی کی طرح ایک طرف تو لہجہ بہت بے باک رکھا تو دوسری طرف پیچیدہ علامتی نظام سے انحراف کرنے کے باوجود راست انداز میں ایک متاثر کن اسلوب سے مزاحمتی لشکر کی پہلی صف میں اپنی جگہ بنائی۔

پھر اس طرح ہوا مجھے مقتل میں چھوڑ کر
سب چارہ ساز جانبِ دربار آ گئے
یہ بھی بڑا کرم ہے سلامت ہے جسم ابھی
اے خسروانِ شہر قبائیں مجھے نہ دو

خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

فراز کی علامتیں اور استعارے مناسب حد تک فیض کے علامتی نظام سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان کے برتاؤ میں فرق کے باعث فراز اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ فیض پر اشتراکیت پسندی کا لیبل لگ چکا تھا اور اس لیبل کا رنگ مزید گہرا ان کو لینن پرائز ملنے سے ہوا۔ فراز نے کچھ تو قصداً ایسا نہ کیا اور کچھ از خود ایسا نہ ہوا کہ سوویت یونین کی توسیع پسندی کے آخری دور یعنی ۱۹۸۰ کی دہائی میں فیض کی وفات کے بعد فراز کئی سال زندہ رہے اور ان کی شاعری میں جمالیت آمیز مزاحمتی قوسِ قزح نمایاں تر ہوتی چلی گئی۔ لگ بھگ اسی دور میں احمد ندیم قاسمی نے اپنی چیدہ چیدہ نظموں اور غزلوں میں دھیما دھیما سا مزاحمتی رنگ اپنایا جو ان شاعری کی نمائندگی نہ کر سکا اور وہ خالص مزاحمتی شاعر کے طور پر اپنی شناخت شاید اس لیے نہ کرا پائے کہ ایسا کرنا ان کی

ترجیحات میں شامل نہ تھا۔ تاہم انھوں نے بسا اوقات چونکا دینے والے انداز میں جب ایسے اشعار کہے تو انھیں مزاحمت نگاروں کی صف سے یکسر خارج کرنا ممکن نہ رہا:

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اٹھتا ہوں
بس یہ خامی ہے مرے طرز مسلمانی میں!

....

چینی محنت کش لڑکیوں کے لباس پر قاسمی صاحب کا یہ منظوم تبصرہ بھی بہت معنی خیز ہے:

یہ لڑکیاں ہیں تو خیاط نے لباس ان کا
کہیں سے بھی تو دبایا نہیں ابھارا نہیں

لبوں پہ رنگ ہیں کوئی نہ رخ پہ غازے ہیں
یہ لڑکیاں ہیں کہ تاریخ کے تقاضے ہیں

....

پھر ان کی ایک اور زبردست نظم "عورت" میں معاشرے اور اشرافیہ کو بیک وقت کچھ یوں رگیدا گیا ہے:

وجود میرا کہیں ہے بھی، یا کہیں بھی نہیں
اُدھر میں دعوت شرب و طعام کے ہمراہ
وہ ناگزیر ضرورت رہی ہوں، جس کے بغیر
ہر ایک عیش کی تقریب نامکمل ہے
اِدھر میں چلتی ہوئی اک مشین کا پُرزہ
جو گھس گیا ہو تو کوڑے کے ڈھیر کا حصہ
اُدھر میں ملکہء عالم کہ جس کے حُسن کا سحر
شہنشہوں کو کھلونا بنائے رکھتا ہے
اِدھر میں صُبح سے تا صُبح ایک خادمہ ہُوں

....

۱۹۶۰ کی دہائی سے لے کر اپنی وفات تک اردو اور پنجابی شاعری میں ایک بہت بلند آواز حبیب جالب کی ہے جن کے کئی شعر اور مصرعے بہت سے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں نے بطور نعرہ اپنائے:

ظلم کے ضابطے
ہم نہیں مانتے
ہم نہیں جانتے

خطرہ ہے زرداروں کو
گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
ساری زمیں کو گھیرے ہوئے ہیں آخر چند
گھرانے کیوں

....

ان شعرا کا بیشتر مقصد تو سیاسی عدم استحکام، معاشی استحصال، بڑھتی ہوئی طبقاتی ناہمواری اور ان سب میں مثبت تبدیلی لانے میں مذہبی عناصر کی ناکامی پر اظہار مایوسی تھا لیکن، جیسا کہ ان دنوں پوری دنیا میں دستور تھا، ایسے شعرا کو فوراً اشتراکیت پسند کہہ دیا

جاتا تھا۔ فیض تو خیر اعلانیہ اشتراکیت پسند تھے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا، لیکن وقت نے ثابت کیا کہ ہر مزاحمتی شاعر کو ایسے عمومی اور حتمی انداز میں ’سرخا/ بائیں بازو کا اہلِ قلم‘ کہنا اتنا مناسب رویہ نہیں تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہی دینی جماعتیں اور رہنما جو ۱۹۹۰ سے قبل ان شعرا پر تنقید کرتے تھے، سرد جنگ کے خاتمے کے بعد انھی شعرا کے اشعار اور مصرعے اپنی تقاریر میں استعمال کرنے لگے۔

مذہبی عناصر/ دائیں بازو کے حامی گروہ اور معاشرے میں مثبت تبدیلی کے خواہشمند ادبا و شعرا/ بائیں بازو والے عناصر کے درمیان یہ تقسیم مزاحمتی ادب اور تحریک کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی اور اس خطے میں کسی بڑی تبدیلی یا انقلاب نہ آنے کا ایک بہت بڑا سبب بھی یہی منفی تقسیم رہی۔

عالمی اور جنوبی ایشیائی خطے میں ماضی قریب میں دو بڑی تبدیلیوں نے شاید یہاں کے شعرا کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا دنیا کے اور ممالک کے اہلِ قلم کے ہاں دیکھنے میں آیا۔ ایک بڑی سیاسی کروٹ تو ۱۹۹۰ کے لگ بھگ سرد جنگ کا خاتمہ اور دوسرا نائن الیون/ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کا واقعہ تھا جس نے پوری دنیا کو عمومی اور جنوبی ایشیا کو خصوصی طور پر جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ ہماری شاعری اور نثری ادب پر ان عظیم عالمی تبدیلیوں کا برائے نام اثر بھی نہ ہونا یہاں کی کمزور اور غیر منظم مزاحمتی ادبی تحریک کا ایک مضبوط سبب ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے نے ایک طرف عالمی سیاسی صورتحال یکسر بدل کے رکھ دی تو دوسری طرف اس کا اثر عالمیانے/ گلوبلائزیشن کے عمل کی صورت میں معاشی اثرات بھی دکھانے لگا۔ ان دو مضمرات کے خلاف بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا لیکن جانے کیوں ہمارے شعرا و ادبا نے متوقع مستعدی نہ دکھائی۔ اسی طرح نائن الیون کے بعد بھی خوفناک واقعات و عوامل مزاحمتی شاعری کے لیے اچھا بھلا خام مال مہیا کرتے رہے لیکن اردو شاعری کے کارخانے بہت عمدہ مصنوعات متعارف نہ کرا سکے۔

اس طرح یہ تو واضح ہو گیا کہ مزاحمت نہ صرف ملکی بل کہ علاقائی اور بین الاقوامی سطح کے واقعات و سانحات کے ردِعمل کے طور پر بھی معیاری ادب کے لیے تحریک بن سکتی ہے۔

شاید ہمارے اہلِ قلم کی مسلسل ظاہری اور پوشیدہ تقسیم کے ساتھ معاشرے میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے متحدہ اور منظم کاوشوں کا نہ ہونا بھی مزاحمتی تحریک کے لیے مزاحم ثابت ہوتے رہے جس کے نتیجے میں

مزاحمتی تحریک اپنے ارفع مقاصد حاصل نہیں کر سکی۔ تاہم ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ گزشتہ تین عشروں کے دوران کئی بڑے شعرا نے معاشی و معاشرتی عدم استحکام اور کمزوروں کی بے بسی کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر اپنے حصے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

شاہین عباس، عباس تابش، امجد اسلام امجد، احمد مشتاق، سعود عثمانی، شہزاد نیر، رحمان حفیظ، حمیدہ شاہین، عنبرین صلاح الدین اور عرفان صدیقی گزشتہ تین دہائیوں میں بہت نمایاں اور محترم شعرا کے طور پر ابھرے۔ عرفان صدیقی کا ایک شعر مزاحمتی شاعری کے کئی اشعار کے برابر بل کہ ان پر حاوی ہے:

رات بھر فتح تو پاتا نہیں لیکن یہ چراغ
کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے۔

شہزاد نیر کی شاعری میں مزاحمت نگاری بآسانی مل جاتی ہے، جیسے:

سماں بدلنے کی کچھ تو اساس رہنے دے
چمن میں سرخ بہاروں کی آس رہنے دے

بجا کہ دہر میں سامانِ انقلاب نہیں
متاعِ خوئے بغاوت تو پاس رہنے دے

....

محتسب دامنِ تعزیر کشادہ رکھنا
شہر کا شہر بغاوت کی سزا مانگتا ہے

کچھ نہ مل پائے تو مجبور طبیعت انساں
مسجد و دیر و کلیسا سے دعا مانگتا ہے

....

جتنے یہ مصرعے پرکشش ہیں، بین السطور پیغام ان سے بھی زیادہ دلکش ہے کہ یہی امتزاج عمدہ شعر کا ضامن ہوتا ہے۔ تاہم اس ضمن میں شہزاد نیر کی ایک نمائندہ نظم "سامراج" سے کچھ مصرعے پیش نہ کرنا ناانصافی کے مترادف ہوگا:

کس کے الفاظ رعونت کے فلک سے اُترے
جیسے تقدیر گنبدوں پہ نوشتے اُترے
کس نے آنکھوں میں پروئی ہیں پرائی درزیں
میرے آنگن میں نگاہوں سے وہ پھرا کرتا ہے
چھپ کے افلاک میں دنیا کو تکا کرتا ہے
فیصلے بھیجتا رہتا ہے زمانے کے لیے
اور ہتھیار نکلتے ہیں منانے کے لیے
میری تہذیب کا ہر نقش بدل دیتا ہے
اپنے نقشے کی لکیروں سے ملانے کے لیے

....

شہزاد نیر کی طرح سعود عثمانی عصری اردو شاعری میں بہت نمایاں نام ہیں اور انکی شاعری میں جمالیات کے بحرِ ذخار میں مزاحمت کے نمایاں جزیرے ڈھونڈنا

مشکل نہیں۔ کشمیر کے تنازعے پر اک رنگ ملاحظہ ہو:

سینے میں ترازو ہیں جہاں تیر وہ کشمیر
بجتی ہے جہاں پاؤں کی زنجیر وہ کشمیر

آیا ہی نہیں برف پگھلنے کا مہینہ
بدلی نہیں جس دیس کی تقدیر وہ کشمیر

....

موجودہ صدی کی ابتدا میں پاکستان کو ایک بار پھر سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا جب ہماری عسکری قیادت کو جنرل پرویز مشرف نے سول اداروں سے متصادم کرانے کی غلطی کی۔ اس طرح انھوں نے خود کو متنازعہ شخصیت بنا دیا۔ پرویز مشرف نے جب ۲۰۰۷ میں اپنی پیشہ ورانہ وردی سے نکل کر خود کو باقاعدہ سویلین سیاستدان بنانے کی کوشش کی تو سعود عثمانی نے ایک یادگار نظم لکھی جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

نظم: وردی

بھیڑیے کی فطرت سے وحشتیں نہیں جاتیں
زور ٹوٹ جاتا ہے عادتیں نہیں جاتیں
دانت جاتے رہنے سے خصلتیں نہیں جاتیں

———

سانپ کے لیے کوئی محترم نہیں ہوتا
کینچلی بدلنے سے زہر کم نہیں ہوتا

....

اس وقت سماجی ذرائع ابلاغ کی ولادت ہو چکی تھی اور ملک میں اظہار رائے کی آزادی کا صحت مند عمل شروع ہو چکا تھا۔ میری ذاتی رائے میں اہلِ قلم، سیاستدانوں اور عسکری قیادت کو مل کر ایک ایسا ماحول تشکیل دینا چاہیے جس میں اس مثلث کے تینوں ضلعوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ ہو کہ قلم کار بھی عسکری بھی عسکری رہنماؤں کی طرح حب الوطنی سے سرشار ہوتے ہیں، بس اظہار کی صورت مختلف ہوتی ہے۔ ایسا کرنے کے لیے مجھے "مثبت مزاحمت نگاری" کی اصطلاح بہت موزوں لگی کہ ہمارا وطن کسی بھی قسم کے اندرونی تصادم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

آخر میں پس نوشت کے طور پر یہ عرض کرتا چلوں کہ جدید شاعری میں بلاشبہ بہت سے اور بھی محترم اسما ہیں جن کا تذکرہ اس مضمون میں، جو پہلے ہی مقالچے کی حدوں کو چھونے لگا ہے، حوالوں سمیت سمونا ممکن نہیں۔ کوشش ہوگی کہ ایک اور مضمون میں اکیسویں صدی کے تمام بڑے شعرا کی شاعری میں سے مزاحمتی قالب والے اشعار پیش کر کے تفصیلاً گفتگو کی جائے۔

☆☆☆☆☆

حبیب اللہ حاوی کی نعتیہ شاعری...... عشقِ رسولؐ کا شعری آئینہ

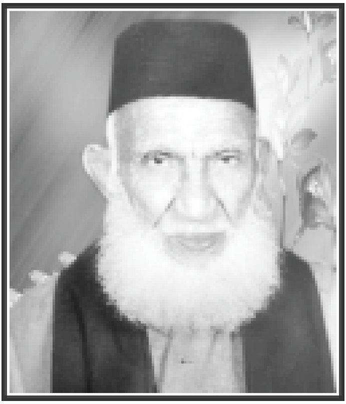

فارسی اور اردو ادب میں نعتیہ شاعری کی ایک عظیم روایت رہی ہے جو صدیوں سے قلب و روح کو تسخیر کرتی آئی ہے۔ اس مقدس صنفِ سخن میں حبیب اللہ حاوی کا نام ایک ممتاز مقام رکھتا ہے ۔ ان کی نعتیہ شاعری محض الفاظ کا ہنر نہیں بل کہ عشقِ رسولؐ کی وہ لازوال داستان ہے جو قاری کے دل میں ایمان کی شمع روشن کر دیتی ہے۔

فارسی ادب میں نعتیہ شاعری کی ابتدا کے حوالے سے تاریخی مصادر بتاتے ہیں کہ ایران پر اسلامی فتوحات کے بعد فارسی زبان نے نعت گوئی کے نئے رنگ اختیار کیے۔ اسی طرح اردو میں نعت کی روایت کو صحابہ کرام کے دور سے جوڑا جاتا ہے، جہاں حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے شعرا نے حضورؐ کی مدحت میں اشعار کہے۔ حبیب اللہ حاوی کی نعتیہ شاعری اسی عظیم سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ استاد الشعراء تاج الادباء حضرت سیدنا شاہ حبیب اللہ حاویؒ کا اسمِ گرامی آسمانِ شعر و تصوف میں موجود ایسا جگمگاتا ستارہ ہے جس کی تابانی میں فرق نہیں آیا۔ آپ اردو لغت نگاری میں منفرد اور یگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

حبیب اللہ حاوی کی نعتیہ شاعری کے ممتاز پہلو عشقِ رسولؐ کی صداقت اور خلوص

....

ساجد فراز شاہجہانی

حبیب اللہ حاوی کے نعتیہ کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے جذبات کی صداقت اور خلوص ہے۔ ان کے ہر شعر میں محبتِ رسولؐ کی وہ کیفیات ملتی ہیں جو صرف مخلصین کے حصے میں آتی ہیں۔ جیسا کہ اردو نعت کے حوالے سے ایک مقالے میں ذکر ہے کہ "نعت گوئی ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں یہ شرف اور سعادت مندی اسی کو حاصل ہوتا ہے جس پر فضلِ خداوندی ہو"۔ حاوی صاحب کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ان کے کلام میں یہ خلوص نمایاں طور پر موجود ہے۔ جیسا کہ

ملا ہے مجھ کو طلب سے سوا مدینے سے
میں جا کہ لایا ہوں فضلِ خدا مدینے سے

اگر ہے فاصلے پر کربلا مدینے سے
مگر ہے قرب کا اک سلسلہ مدینے سے

....

حبیب اللہ حاوی کی نعتیہ شاعری محض عقیدت کا اظہار نہیں بل کہ فنی اعتبار سے بھی انتہائی پختہ ہے۔ انھوں نے نعت کو غزل، نظم اور دیگر اصناف میں برتنے میں کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ جیسا کہ جدید نعت کے حوالے سے ریاض حسین چودھری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "نظم نگاری کی بھی توانا روایت اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے"، یہی بات حاوی صاحب کے کلام پر بھی صادق آتی ہے۔

رسول پاک کے در پر سرِ نیاز رہے
یہی نماز ہے میری یہی نماز رہے

....

حبیب اللہ حاوی نے نعت میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ کئی نئے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ان کے ہاں حضورؐ کے جمال و کمال، معجزات، شفاعت، اخلاق حسنہ اور امت سے تعلق جیسے موضوعات کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ عالم کی نعتوں کے حوالے سے ایک تبصرے میں کہا گیا ہے کہ "انھوں نے اپنی نعتوں کے حوالے سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طہارت و نفاست، حسنِ اخلاق، اسوۂ حسنہ، جلال و جمال، معجزات و کمالات، اختیارات و تصرفات، جود و سخا، عفو و درگزر، لطف و عطا کے علاوہ فراقِ حبیب، ہجر و دیارِ رسول، آپ سے استغاثہ و فریاد، احساسِ گناہ، شفاعت طلبی، اصلاحِ معاشرہ اور انقلابِ امت جیسے موضوعات پیش کئے

ہیں''۔ یہی تنوع حاوی صاحب کے ہاں بھی ملتا ہے۔

جب سے نظر پڑی سرکار دو جہاں کی
خود درد بن گیا ہے اکسیر دل کے اندر

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

شفا ہوگی تو بس ہوگی تمہاری چشمِ عرفاں سے
بجز اس کے نہیں ہے چارہ یارسول اللہ

....

حبیب اللہ حاوی کی نعتیہ شاعری میں زبان و بیان کی شستگی اور فصاحت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ مشکل سے مشکل خیال کو آسان اور دلنشیں الفاظ میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ نعت کے بارے میں ایک جگہ ذکر ہے کہ "لسان و زبان کی بے حد ترقی یافتہ و منزہ ترین صورت کو ادب العالیہ کہتے ہیں"، حاوی صاحب کا کلام اسی ادب العالیہ کی بہترین مثال ہے۔

حبیب اللہ حاوی کی نعتیہ شاعری اردو ادب میں نعت کی روایت کا ایک درخشاں باب ہے۔ ان کا کلام نہ صرف فنی اعتبار سے پختہ ہے بلکہ اس میں عشقِ رسولؐ کی وہ کیفیات موجود ہیں جو قاری کے دل کو گرما دیتی ہیں۔ انہوں نے نعت کو محض ایک رسمی صنفِ سخن نہیں بننے دیا بلکہ اسے اپنے جذبات و احساسات کا ترجمان بنایا۔

جیسا کہ نعت کے بارے میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "نعت رسولِ مقبول ادب منظوم ہے جس کی باضابطہ ابتدا عربی زبان میں ہوئی، وہ عربی زبان جسے اپنے سبعہ معلقہ پر فخر و ناز تھا"، اسی طرح حبیب اللہ حاوی نے اردو زبان میں نعت کو وہ بلندی عطا کی جو اس کے شایانِ شان ہے۔

ان کی نعتیہ شاعری صرف ادبی حیثیت ہی نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک روحانی سفر کا بھی نام ہے جس میں شاعر نے اپنے قاری کو بھی ساتھ لے لیا ہے۔ ان کا کلام نعت کی مقدس روایت کو آگے بڑھانے اور عشقِ رسولؐ کو تازہ کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

حبیب اللہ حاوی جیسے نعت گو شعرا کی بدولت آج بھی نعت کی یہ صنف زندہ و تابندہ ہے اور ان شاء اللہ مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا، کیونکہ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے: "ورفعنا لک ذکرک"، حضورؐ کا ذکر ہمیشہ بلند رہے گا اور حبیب اللہ حاوی جیسے شعرا اس ذکر کو شعری صورت میں زندہ رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نئی تنقیدی روایت [تعارف]

اُردو ادب میں تنقید کی تاریخ ایک طویل اور متنوع سفر ہے۔ کلاسیکی دور میں شاعری اور نثر کی تشریح زیادہ تر ذوق و جمالیات، اخلاقی اصول اور رواج کے تناظر میں کی جاتی تھی مگر بیسویں صدی کے وسط سے جدید نظریات نے اردو ادب کی تشریح میں ایک نیا زاویہ متعارف کروایا، جسے ہم ''نئی تنقیدی روایت'' کہہ سکتے ہیں۔

یہ روایت ادب کے فنکارانہ، جمالیاتی اور ساختیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ سماجی اور ثقافتی پس منظر کو مدنظر رکھتی ہے۔ جدید اردو تنقید نگار ادب کے ہر فن پارے کو ایک خود مختار متن (Autonomous Test) سمجھ کر اس کی گہرائی اور پیچیدگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔

مغربی تنقید نگاری جیسے T.S. Eloit, I.A. Richard, F.R. Leavis اور Northrop Frey نے جدید تنقید کے نظریات پیش کیے، جنھوں نے اردو ادب کی تنقیدی جہت کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے نظریات اردو ادب میں نئے سوالات، نئے زاویے اور نئے انداز تخلیق کرنے کی تحریک ہے۔

نئی تنقیدی روایت کی خصوصات:

(1) متن پر مرکوز تنقید: نیو کریٹیسزم کے اصول کے مطابق، ہر ادبی متن خود کو مکمل ہوتا ہے اور اس کے اثرات اور مفہوم کا مطالعہ متن کی ساخت اور زبان کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔ اردو ادب میں یہ رجحان خاص طور پر غلام احمد فاطمی اور احمد ندیم قاسمی کے تنقیدی مضامین میں نظر آتا ہے، جہاں شاعر یا مصنف کی نیت سے زیادہ متن کی ساخت، الفاظ، اور محاورے کی تحلیل اہمیت اختیار کرتے ہیں۔

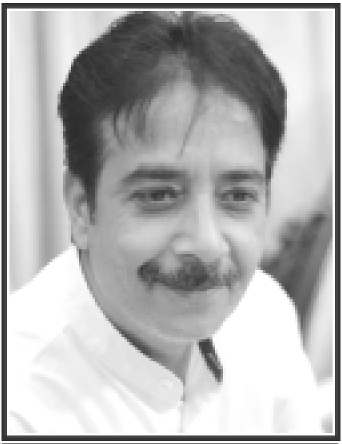

نعمان منظور

(2) فن پارے کی خود مختاری: کے مطابق، ادب کی قدر اس کے اندرونی جمالیاتی معیار اور انسانی تجربے کے ادبی اظہار میں پوشیدہ ہے۔ اردو ادب میں F.R Leavis بھی نئی تنقیدی روایت میں یہی اصول اپنایا گیا، جہاں فن پارے کو اپنی ثقافتی یا تاریخی وابستگیوں سے الگ کر کے پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔

(3) ساختیاتی اور زبان پر مبنی تنقید: ساختیاتی تنقید (Structuralism) میں ادبی کاموں کی اقسام، صنفیں، اور ان کے عناصر کی شناخت اہم ہے۔ محسن جاوید کے نظریات میں یہ واضح ہے کہ اُردو نثر اور شاعری میں لفظ، جملہ اور صنف کی ساخت کا تجزیہ فن پارے کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

(4) معاشرتی اور ثقافتی زاویے: نئی تنقیدی روایت ادب کو محض فنکارانہ مظاہر تک محدود نہیں رکھتی۔ یہ روایت معاشرتی، ثقافتی اور تاریخی سیاق وسباق کو بھی مد نظر رکھتی ہے۔ اردو ادب میں پروین شاکر کے ناقدین اور دیگر فیمنسٹ ناقدین نے صنف، اور سماجی مسائل کی بنیاد پر متن کا تجزیہ پیش کیا، جو مغربی تنقید نگاروں جیسے Elaine Showalter اور Julia Kristeva کے نظریات سے متاثر ہے۔

اردو ادب میں نئی تنقیدی روایت

اردو ادب میں نئی تنقیدی روایت کی ابتدا بیسویں صدی کے وسط میں ہوئی۔ کلاسیکی شاعری اور نثر سے ہٹ کر، ناقدین نے متن کے فنکارانہ، جمالیاتی اور سماجی پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ چند اہم اردو تنقید نگار جنھوں نے اس روایت کو فروغ دیا:

غلام احمد فاطمی: ادب میں جمالیاتی اور معنویت کے تعلق کو اُجاگر کیا، اور متن کے اندرونی اصول پر زور دیا۔

محسن جاوید: اردو نثر میں ساختیاتی اور زبان پر مبنی تجزیہ پیش کیا۔

پروین شاکر کے ناقدین: فیمنسٹ زاویے سے اردو ادب میں صنفی مسائل اور عورت کے کردار پر روشنی ڈالی۔

احمد ندیم قاسمی: ادب کے نصوص میں جمالیاتی تجزیہ کے ساتھ ثقافتی اور تاریخی پہلوؤں کی اہمیت بیان کی۔

یہ تنقید نگار نہ صرف متن پر توجہ دیتے ہیں بل کہ ادب کے معاشرتی، ثقافتی اور تاریخی پہلوؤں کو بھی مد نظر رکھتے ہیں، جس سے اردو ادب میں تنقیدی مطالعے کی گہرائی اور وسعت میں اضافہ ہوا۔

انگریزی ادب کی تنقید سے اثرات:

اردو تنقید پر انگریزی ادب کے نظریات کا اثر واضح ہے:

(1) نیو کریٹیسزم (New Criticism)
متن پر مرکوز تنقید، جیسے I. A. Richards کے اصول، اردو ادب میں غلام احمد فاطمی کے مضامین میں نظر آتے ہیں۔

(2) ساختیاتی تنقید (Structuralism):
Northrop Frye کے نظریات کی روشنی میں اردو ادب میں صنف اور فن پارے کی ساخت پر غور کیا گیا۔

(3) پوسٹ سٹرکچرلزم اور فیمنسٹ تنقید:
Elaine Showalter اور Julia Kristeva کے اثرات اردو ادب میں صنف، جنس، اور سماجی مسائل کی بنیاد پر متن کا تجزیہ کرنے میں نظر آتے ہیں۔

ان نظریات نے اردو ادب کی تنقیدی روایت کو نہ صرف فنکارانہ بل کہ علمی اور فلسفیانہ بنیادوں پر بھی مستحکم کیا۔

تنقید کی جہتیں

نئی تنقیدی روایت نے اردو ادب میں کئی نئے امکانات پیدا کیے ہیں:

ادب میں تشریح اور تجزیہ کی گہرائی بڑھ گئی ہے۔

صنف اور زبان کی ساختیاتی پہچان اہم ہوئی۔

معاشرتی اور ثقافتی نظریات تنقید کا حصہ بن گئے۔

ادبی کاموں کا خودمختاری اور جمالیاتی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

متن کے ساتھ قاری کا تعلق اور تنقیدی تعامل بڑھا، جس سے ادب کی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوا۔

نتیجہ (تفصیلی اور تجزیاتی)

نئی تنقیدی روایت اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ روایت ادب کے مطالعے میں ایک وسیع، متوازن اور فکری نقطہ نظر پیش کرتی ہے، جو متن کی جمالیات، ساخت اور زبان کے عناصر کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

نئی تنقیدی روایت نے اردو ادب میں ناقد اور قاری دونوں کے لیے ایک نئی سوچ اور بصیرت پیدا کی ہے۔ متن کی گہرائی میں اُتر کر، قاری نہ صرف ادبی جمالیات سے لطف اندوز ہوتا ہے بل کہ ادب کے سماجی اور انسانی پیغامات کو بھی سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔

یہ روایت اردو ادب کو عالمی ادبی تنقیدی کے رجحانات کے ساتھ جوڑتی ہے، جس سے ادب کی بین الاقوامی سطح پر اہمیت اور

تحقیق میں آسانی پیدا ہوئی ہے۔ نئے زاویے جیسے ساختیاتی تنقید، فیمنسٹ تنقید، پوسٹ سٹرکچرلزم، اور متن پر مرکوز تنقید نے اردو ادب کی تنقیدی جہت کو وسعت دی، اور ناقدین کو علمی، فلسفیانہ اور جمالیات کے نئے آلات فراہم کیے۔

مزید برآں، نئی تنقیدی روایات نے اردو ادب میں فن پاروں کی خودمختاری اور ان کے اندر موجود جمالیاتی معیار کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ یہ روایت اس بات پر زور دیتی ہے کہ ادبی کام کو صرف تاریخی یا ذاتی سیاق و سباق کے تحت نہیں پرکھا جانا چاہیے، بل کہ ہر متن خود میں مکمل اور قابلِ مطالعہ ہوتا ہے۔ اس سے اردو ادب میں تنقیدی مطالعے کی آزادی اور گہرائی میں اضافہ ہوا ہے۔

نئی تنقیدی روایت نے اردو ادب میں قاری اور ناقد کی علمی تربیت کو بھی فروغ دیا ہے۔ ناقد کو متن کے فنکارانہ، ساختیاتی اور جمالیاتی عناصر کی شناخت کی ترغیب ملتی ہے، جب کہ قاری متن کے ساتھ فکری اور جذباتی تعلق قائم کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ تعلق نہ صرف ادب کی سمجھ بوجھ میں اضافہ کرتا ہے بل کہ قاری کو معاشرتی اور فلسفیانہ شعور بھی عطا کرتا ہے۔

آخر میں، نئی تنقیدی روایات اردو ادب کو ایک فکری، جمالیاتی، اور فلسفیانہ بنیاد فراہم کرتی ہے، جس کے ذریعے ادب نہ صرف محض متن کے طور پر بل کہ معاشرتی اور انسانی تجربے کے آئینے کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ نتیجتاً، نئی تنقیدی روایت اردو ادب میں تحقیق، مطالعے اور تنقیدی گفتگو کو ایک مستحکم اور روشن پلیٹ فارم فراہم کرتی ہے، جو آنے والے وقت میں اردو ادب کی ترقی اور عالمی ادبی مقام میں اضافے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

حوالہ جات (References)

1. T. S. Eliot, The Use of Poetry and the Use of Criticism

2. I. A. Richards, Practical Criticism

3. F. R. Leavis, The Great Tradition

4. Northrop Frye, Anatomy of Criticism

5. Elaine Showalter, A Literature of Their Own

6. Julia Kristeva, Revolution in Poetic Language

☆☆☆☆☆

چائے ہماری بسکٹ آپ کے

خواتین و حضرات آپ ہمارا پروگرام ملاحظہ فرما رہے ہیں جس کا نام ہے "چائے ہماری بسکٹ آپ کے"_ نہ صرف یہ ایک پروگرام کا نام ہے بل کہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بھی ہے۔
کیونکہ اس پروگرام میں جو لوگ شریک ہیں وہ بسکٹوں کے ڈبے ہمراہ لائے ہیں۔
ہم آپ کو پورا یقین دلاتے ہیں کہ ہم تھوڑے سے بسکٹ کھا کر باقی اگلے مہمانوں کے لیے بچا کر رکھ لیں گے۔
تو چلیے شروع کرتے ہیں آج کا پروگرام اور آپ کا تعارف اپنے مہمانوں سے کرواتے ہیں_
چیچو کی ملیاں سے مشہور طبیب "خان چیچک موسے والا" تشریف لائے ہیں۔
جبکہ اوکی سے مشہور و نامور وکیل "اگوں کی تے پچھوں کی" بطور خاص حاضر و ناظر ہوئے ہیں۔
علاوہ ازیں ڈنڈوت سے "حاجی ڈنوتک صاحب" نے محفل کو آ کر چار چاند لگا دیے ہیں۔
پروگرام کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے میں سب سے پہلے گفتگو کرنا چاہوں گی "خان چیچک موسے والا" سے۔
محترم: السلام علیکم، سب سے پہلے تو ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کا نام چیچک موسے والا" کیسے پڑ گیا؟
چیچک موسے والا: محترمہ میں اسم بامسمّیٰ کی اعلیٰ تصویر ہوں۔ مجھے چار سو بیس قبل مسیح میں چیچک ہو گئی تھی۔ جس کا علاج تا حال نہ ہو سکا۔ لیکن "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" کے تحت خود ہی ٹھیک بھی ہو گئی۔
میزبان: بہت اچھے بل کہ بہت ہی اچھے_ اس پروگرام کے توسط سے آپ مزید کیا کہنا چاہیں گے؟
چیچک موسے والا: میں اس پروگرام کے توسط سے تمام خواتین کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اب میری چیچک مکمل طور پر ٹھیک ہو چکی ہے اور اب میں بلا چیچک رشتہ کر سکتا ہوں۔ لہٰذا پاکستان کے چاروں صوبوں سے چار خواتین مجھ سے فوری رابطہ کریں۔
میزبان (حیرانی سے): چار خواتین کیوں رابطہ کریں۔
چیچک موسے والا: دراصل چیچک کی دوا کھانے سے میں اپنے اندر بے پناہ طاقت محسوس کرتا ہوں۔ اسی لیے یہ پیشکش بے پناہ کرنے کی جسارت اعلیٰ کی ہے۔

سیدہ آمنہ ریاض

میزبان: محو حیرت ہوں ------ میرا دوسرا سوال اگوکی سے "اگوں کی تے پچھوں کی" سے ہے کہ آپ کے اس نام کے پیچھے کیا حقیقت ہے؟

اگوں کی تے پچھوں کی: سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ اس قدر فارغ التحصیل پروگرام میں مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ میں اگوکی کا ایک نامور اثاثہ ہوں۔ لوگ وکلاء کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ منہ پہ کچھ اور پیچھے کچھ اور ہوتے ہیں۔ ان باتوں سے تنگ آ کر میں نے اپنا نام "اگوں کی تے پچھوں کی" رکھ لیا۔

میزبان: ارے واااہ ---- انتہائی دل گرفتہ بات کر کے آپ نے محفل لوٹ لی۔ ہمارے ناظرین کو یہ بتایئے کہ وکالت میں آپ کتنا تجربہ رکھتے ہیں؟

اگوں کی تے پچھوں کی: جی بالکل وکالت میں میں وسیع و عریض رقبہ رکھتا ہوں۔ جو سو فیصد میری حق حلال کی ناجائز کمائی کا ہی نتیجہ ہے۔

میزبان: شاندار

اب میں ملاقات کا شرف حاصل کروں گی ڈنڈوت سے "حاجی ڈنٹونک صاحب" سے حاجی صاحب آپ ہمارے ناظرین کو بتایئے کہ آپ نے یہ نام کیوں رکھا؟

حاجی ڈنٹونک: بچپن میں جب جب ٹی وی پر ڈنٹونک کا اشتہار چلایا جاتا تو میں زور زور سے ہنستا اور تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کرتا تھا۔ جس پر گھر والوں نے میرا نام ہی ڈنٹونک رکھ دیا۔ جبکہ حج کی سعادت میں نے پچھلے سال ہی حاصل کی تھی۔

میزبان: کیا کہنے بلکہ بہت ہی متاثر کن۔ لیکن ہم نے تو سن رکھا ہے کہ آپ دانتوں کا علاج بھی کرتے ہیں؟

جی بالکل سب سے پہلے میں نے اپنے تجربات گدھوں پر کیے۔ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسانوں پر بھی یہ تجربات صادق آئیں گے۔

میزبان: تو پھر ان گدھوں کے دانت تو بہت چمکدار ہوں گے؟

حاجی ڈنٹونک: ان کے دانت دیکھنے کی نوبت ہی نہ آ سکی کیونکہ وہ دوا کھاتے ہی اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔ علاوہ ازیں کل میری جانب سے دی گئی جس دعوت میں آپ ددھ ودھ کے گوشت نوش فرما رہے تھے۔ وہ انہی مرحوم گدھوں کا تھا۔

میزبان: لاحول ولا قوۃ ---- استغفراللہ ---- میں بھی کہوں کہ کل سے میرا گھاس کھانے کا کیوں دل چاہ رہا ہے-- میں آپ کو یہ بتانا بھول گئی تھی کہ اس پروگرام کا کوئی بھی حصہ کاٹا نہیں جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے پروگرام کا قلع قمع ہوا چاہتا ہے۔ کیونکہ سوا ستیاناس پہلے ہی ہمارے مہمانوں نے آپ کا کر دیا ہے۔ خدا کے لیے اس گفتگو کو دل پر نہ لیجیے گا کیونکہ آپ میں سے بہت سے لوگ پہلے ہی دل کے مریض ہیں۔ اگلے پروگرام تک کے لیے ہم سب کا خدا ہی حافظ۔

☆☆☆☆☆

پیر طویل مرزا یعنی نوید مرزا

ایک بہت پرانی گئی گزری ٹھنڈی صبح کا ذکر ہے جب میں اور محترم بشیر رحمانی مجلس ترقی ادب کے لان میں بیٹھے۔ اللہ کی دھوپ اور لوگوں کی باتیں سیکھ رہے تھے پھر یونہی باتوں باتوں میں ہم نے اپنی اپنی جنرل نالج بڑھانے کے لیے ایک دوسرے سے سوال پوچھنے شروع کر دیے۔ بشیر رحمانی کا پہلا سوال ہی آخری تھا۔ انھوں نے پوچھا بھائی شاہ صاحب آپ کچھ بتائیے میں نے کہا مدت گزری احمد ندیم قاسمی صاحب کے رسالہ فنون میں کام کرتا آ رہا ہوں۔ ایک خاکوں کا مجموعہ کلوزاپ چھپ چکا ہے۔ 'سفر واجب ہوا' نظموں کا مجموعہ ہے رحمانی صاحب نے بھاری سے ہوں کی اور گردن ہلائی۔ پھر میں نے سوال کیا آپ یہاں کیسے آگئے، تو انھوں نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر اپنی گیروی رنگ کی ٹوپی سر سے اُتاری اپنے سر پر خود ہی شفقت کا ہاتھ پھیرا ٹوپی کو جھاڑا۔ اس کی کریس سیدھی کی اور ہلکی پھلکی سی ٹوپی کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر سر پر رکھا اور بھاری آواز میں بولے، بھائی شاہ صاحب پاکستان کیا آئے، سب کچھ ہی بدل گیا بس یادیں ہیں، بیوی ہے بچے ہیں مکان ہے یار دوست ہیں کچھ سال پہلے ریٹائرمنٹ اختیار کی ہے بھائی ہم نہ دین کے نہ دنیا کے مگر میرے بیٹے نوید مرزا کو شاعری کا شوق ہے۔ اس کی ایک ادھ غزل کہیں چھپی بھی ہے، بل کہ مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔ ٹھنڈا سورج ہاں جی ''ٹھنڈا سورج'' نوید مرزا کا کلام ہے۔

نوید مرزا کا نام سن کر مجھے کچھ حیرت ہوئی کہ گزشتہ پانچ چھ سال سے جس نوید مرزا نامی گرامی شخص کو میں جانتا ہوں وہ اس درویش صفت گیروی ٹوپی والے شخص کا بیٹا ہے، جی

اعجاز رضوی

ہاں نوید مرزا، شاعر احساس نعت نگار غزل گو ادبی تقریبات کے منتظم محترم بشیر رحمانی صاحب کا بیٹا ہے۔ نوید مرزا ایک تخلیق کار ہے، اور اس کی تخلیق کے دائرے میں، نظم ونثر دونوں مل کر یوں گھوم رہے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ نثر میں اچھا کام کر رہا ہے یا شاعری میں بس نوید مرزا لکھ رہا ہے یہ سرکاری ملازمت بھی کرتا ہے مگر اس کا اصل روزگار ادب ہے شاعری کرنا ، نثری کتابیں لکھنا، کتابیں مرتب کرنا، تالیف کرنا اور نئے نئے زاویے سے ادب کی ترویج کرنا اس کا مشن ہے، یہ درویشی کے راستے پر چلتا ہے اس کی درویشی کی نگاہ دور بیٹھے ہر منافع کو دیکھ لیتی ہے اور یہ حاصل بھی کر لیتا ہے۔

کس ادارے میں کتاب چھپانے کا کتنا بجٹ موجود ہے کون کتنے پیسے دے گا، کس کتاب مرتب کرنے سے کتنا نذرانہ ملے گا کس نے کون سی فائل کہاں رکھی ہوئی ہے پھر اگر کوئی ادارہ یا شخص اپنا پروگرام اور رقم اس سے خفیہ رکھے تو یہ روشندان سے ہاتھ ڈال کر پروگرام اور رقم نکال لاتا ہے اور خوش ہو کر کہتا ہے:

یوں نوازا بلندیوں نے مجھے
میں زمیں پہ ہو کے آسماں میں تھا

یہ اکثر پینٹ شرٹ پہنتا ہے مگر کبھی کبھی نذر نیاز کے چکر میں شلوار قمیض کا رعب بھی ڈالتا ہے، مگر دونوں لباس اس کی شخصیت پر جچتے ہیں پر پینٹ ہو یا شلوار ہمیشہ ہی گیٹوں سے اوپر ہی رہتی ہے کہ درزی چاہے جتنی لمبائی رکھے اس کے لیے تو کم ہی پڑتی ہے۔

یہ خوشی میں بولے تو اس کا منہ مومن کا منہ لگتا ہے اور اگر یہ شکایت یا افسوس کی بات کر رہا ہو تو یہ ہی منہ بچوں کو ڈرنے کے کام بھی آسکتا ہے۔ یہ کرسی پر بیٹھا ہو تو اس کا آگے بڑھا ہوا۔ پیٹ لوگوں کو اولاد نرینہ کی مبارک باد دینے پر مجبور کرتا ہے۔

نوید مرزا کا قد اتنا لمبا ہے کہ اس میں سے راجا نیئر جیسے دو نکل سکتے ہیں، یہ راجا نیر سے بہت پیار کرتا ہے، کسی دانشور کی بات ہو تو یہ راجا نیئر کا نام لیتا ہے کسی شاعر کا ذکر ہو تو یہ راجا نیئر کا نام لیتا ہے۔ کسی گنجے کا ذکر کریں تب بھی یہ راجا نیئر کا نام ہی لیتا ہے۔ یہ بھی اس لیے کہ یہ جس بلندی سے لوگوں کو دیکھتا ہے وہاں سے صرف راجا ہی نظر آتا ہے۔

نوید مرزا ایک نیک آدمی ہے، یہ کسی کی غیبت نہیں کرتا کے کسی کا کان اس کے منہ تک ہیں آتا، یہ کسی کی برائی نہیں سنتا کہ کسی کا منہ اس کے کان تک نہیں آتا، یہ ہر حال میں خوش رہنے والا بندہ ہے مگر خوشی ہو یا غمی یہ کسی سے گلے نہیں ملتا کہ اس طرح بے دھڑک گلے ملنے سے ملن والے کا سر اس کے کسی نازک حصے سے جا ٹکراتا ہے اور پھر خوشی سے ہیلو ہائے کے بجائے اس کے منہ سے

زوردار ہائے نکل جاتی ہے۔

یہ چلتا ہوا آرہا ہو تو یوں لگتا ہے لہراتا ہوا آرہا ہے اس کے گلے میں پڑے ہوئے بیگ کو دیکھ کر لگتا ہے کسی بڑے ٹرالے کا میکینک ہو، نوید مرزا کے نام کے ساتھ مرزا لگا ہوا ہے اس لیے لوگ اس کو بھی صاحباں والا مرزا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بادشاہ بابر ہمایوں جہانگیر سے ہوتا ہوا بہادر شاہ ظفر والا، مظلوم مرزا ہے، کسی زمانے میں اس کے اجداد خود کو اعلانیہ مغلیہ خاندان کا فرد کہتے تھے، جو نوید مرزا تک آتے آتے، اب مغلیہ خاندان سے مشغلیہ خاندان میں بدل گیا ہے یہ ہمیشہ مسکراتا ہے، مگر اس کی مسکراہٹ کسی کو نظر نہیں آتی کہ اس کی مسکراہٹ دیکھنے کے چکر میں لوگوں کی کھڑی ٹوپیاں گر جاتی ہیں۔ نوید مرزا نے اپنے اباجی کے اُستاد ذوقی مظفر نگری کو ہی اپنا اُستاد بنایا، تھا مگر اباجی کی طرح اس کی اُستاد سے بھی نہیں بنی کہ جس شعر کو یہ بلندی سے سوچتا تھا، ذوقی مظفر نگری اس کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے تھے، مثلاً کے طور پر یہ کہتا:

اک چمکتے ہوئے ستارے سے
میں نے کل رات گفتگو کی تھی

....

تو ذوقی صاحب فرماتے، ارے یہ کون سا ستارہ ہے، جو تجھ سے تو گفتگو کرتا ہے مگر ہم بولیں تو خاموش رہتا ہے ارے بھائی میاں اس حرام خور ستارے کو نیچے لاؤ، ہم سے بھی ملواؤ“

اکیلے اکیلے ستاروں سے گفتگو کرنا، اچھی بات نہیں ہے بس یہی دخل اندازی نوید مرزا کو بُری لگتی تھی، سو اس نے بہت جلد اپنے اُستاد کو چھوڑ دیا، نوید مرزا سڑکوں پر چلتا پھرتا نظر آئے، تو یوں لگتا ہے جیسے ٹانگوں پر ڈنگ باندھ کر پھر رہا ہے۔ یہ سرسبز درخت کے سائے میں کھڑا ہو تو چڑیاں شور مچا دیتی ہے کہ یہ شاعر ہمارے گھروں میں جھانکتا ہے۔

نوید مرزا چڑیوں کے گھروں میں کیا کسی کے گھر میں نہیں جھانکتا، یہ شیر کی کچھار میں اپنا رزق تلاش کرتا ہے، اور ہر روز بڑی بہادری سے گھر واپس آتا ہے، اس کے بیگ میں کتابیں ہوتی ہے جو یہ اپنے ہر دوست کو دیتا ہے، کہ بہرحال مغلیہ خاندان کا فرد ہے اور مغلوں نے افغانستان سے آکر ہندوستان پر صرف تسلی کے زور پر حکومت کی تھی۔

سو میں اپنے اس مغلیہ خاندان کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چشم و چراغ نوید مرزا، عرف پیر طویل مرزا رحمانی کی بیعت توڑ کر شغلیہ خاندان روشن ضمیر انتھک ہونہار قلمکار، نوید مرزا کو دعا دیتے ہوئے اس کی بیعت کا اعلان کرتا ہوں۔

کہ سردار کا قد آور ہونا، قبیلہ کے لیے فخر اور فتح کا اشارہ ہوتا ہے۔

پھر سردار شاعر ہو تو بڑی بات ہے۔

☆☆☆☆☆

پیمانہ

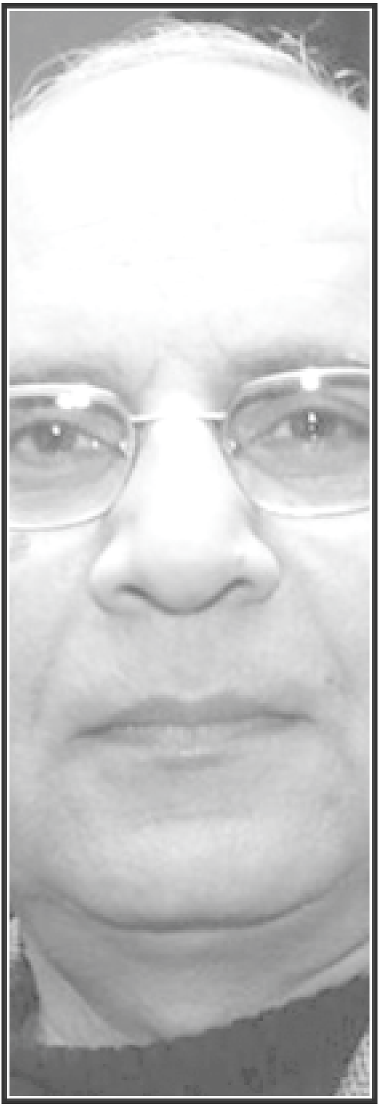

جلیل عالی

مرے انداز کی
تقلید میں
کمزور و بے تاثیری
نظمیں بھی
جو لکھے،
بہت اچھا سخنور!

مرے اسلوب میں
یا پھر
مرے اسلوب سے ہٹ کے
کسی پہلو
کہیں اعجاز کر جائے
اگر کوئی
تو
نا شاعر!

نیا سال

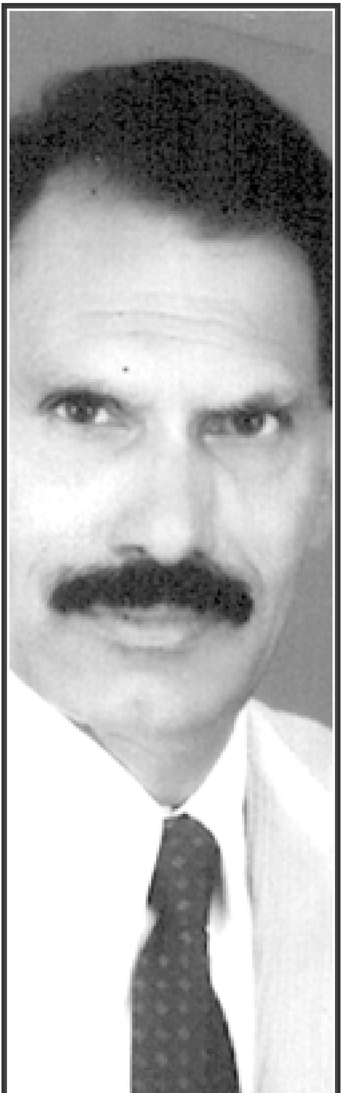

احمد جلیل

غلغلہ سالِ نو کا ہے پھر سے
دیکھئے اب یہ کیا ستم ڈھائے

پچھلے سالوں کے زخم بھی ہیں ہرے
جانے کیا یہ جلو میں اب لائے
مجھ کو خوش فہمیاں نہیں ہیں جلیل
پھر بھی آسوں کے پھول مہکائے
سوچتا ہوں بہار آئے گی
جب نیا سال پھر سے آئے گا

خوشیوں کے پھول مسکرائیں گے
ہر طرف دیپ جگمگائیں گے
نور سے ہر نگر سجائیں گے
ڈرتا ہوں پیچھے غم کی شام نہ ہو

میرا یہ بھی خیال خام نہ ہو
میرے ہاتھوں میں خالی جام نہ ہو

یہ مچلتی ہوئی تمنا ہے، اس کی تعبیر جانے
کیا ہو جلیل
سالِ رفتہ سا یہ بھی ہو نہ بخیل
اس اندھیرے میں کچھ نہیں معلوم
کون جانے مرا ہے کیا مقسوم!!!

نظم

[والدِ گرامی کی 33 ویں برسی کے موقع پر]

خُلق و ایثار سے کتنی تھی محبت تیری
میرے بابا! تیری درویشی تھی راحت تیری

جو بھی تھا پاس لٹا ڈالا خوشی سے اپنی
اپنے بچوں پہ رہی خوب سخاوت تیری

کتنا ہنس ہنس کے مَیں لہروں پہ سفر کرتا تھا
میری نیّا کو بھی حاصل تھی رفاقت تیری

ساری دُنیا میں نہیں کوئی بھی تیرے جیسا
کر سکوں کیسے بیاں میں بھلا عظمت تیری

زیست کے گہرے بھنور سے بھی گزر جاتا تھا
میری آنکھوں کے سمندر میں تھی چاہت تیری

مجھے احساس کا فیضانِ نظر تجھ سے ملا
تجھ سے پائی ہے یہ دولت تو عنایت تیری

تجھ سے سیکھے ہیں یہ آدابِ دل و دُنیا سارے
یہ بھی ہے میرے لیے گویا کرامت تیری

اِک گھنے پیڑ کی صورت تھا وفا کا رشتہ
جو نبھائی ہے وہی رسم تھی عادت تیری

تھام کر ہاتھ مجھے چلنا سکھایا تُو نے
مجھ پہ واجب ہے ہمیشہ کروں بیعت تیری

نثار ترابی

وہ جو دیتا ہے ایک دم آواز

وہ جو دیتا ہے ایک دم آواز
کوئی لگتا ہے میرا ہم آواز

دیکھ خاموش ہو گیا ہوں میں
اور کتنی کروں میں کم آواز

آ کبھی دیکھ میری آنکھوں میں
آ دکھاؤں میں تجھ کو نم آواز

ورنہ تجھ کو سنائی دیتا میں
شور میں ہو گئی تھی زم آواز

جب بھی خوشیوں کے گھر پہ دستک دوں
دینے لگتا ہے کوئی صنم آواز

میں نے تنہائی میں، اذاں دے کر
آسمانوں پہ کی رقم آواز

سننے والا نہ جب رہا کوئی
آئے گی ایک ، ایک دم آواز

کہہ رہا ہوں حسین تجھ پہ سلام
سن رہا ہے کہیں علم آواز

صغیر احمد صغیر

دل میں طلوع ہوتی ہوئی صبح [نثری نظم]

رات کی آخری سانس
ہولے سے بجھ رہی تھی
جیسے کوئی پرانا چراغ
اپنی تھکن خدا کے سپرد کر دے۔
اسی پل
افق کے پردے کے پیچھے
روشنی نے ایک نیا راستہ تلاش کیا
اور وقت کے دروازے پر
خاموشی سے دستک دی۔
نیا سال
کوئی ورق پلٹنے کا نام نہیں؛
یہ تو روح کا وہ لمحہ ہے
جب انسان اپنے اندر
ایک نئی صبح کو طلوع ہوتے دیکھتا ہے۔
ایک سفید پرندہ
وقت کی آغوش سے نکل کر
میرے شانے پر بیٹھتا ہے
اور آہستہ سے کہتا ہے:
''جو گزر گیا ہے
اسے ہواؤں کے حوالے کر دو
میں بوجھ لے کر اُڑ نہیں سکتا۔''
پھر ایک بیج
نیت کا، دعا کا، یا خواب کا
میرے دل کی مٹی میں دب جاتا ہے۔
یہ بیج جانتا ہے
کہ اندھیری مٹی ہی میں
روشنی کا آغاز ہوتا ہے۔
اسی لمحے
میرے سامنے ایک آئینہ کھلتا ہے
وہ نہیں
جو چہرے دکھاتا ہے؛
وہ آئینہ
جو مجھے مجھ سے ملاتا ہے،
میرے اندھیروں اور میری روشنی
دونوں کا حساب لیتا ہے۔
دور کہیں
کائنات کی کوئی گھنٹی بجتی ہے
ایک بار...

صرف ایک بار...

جیسے رب کہہ رہا ہو:

"اٹھو

میں نے تمہارے نصیب کی دہلیز پر

نور کا نیا پیالہ رکھ دیا ہے۔

اب یہ تمہارا فیصلہ ہے

کہ اسے کس ذائقے سے بھرتے ہو۔"

آؤ

اس صبح کو

صرف نیا سال نہیں

اپنی روح کا نیا سفر سمجھیں۔

خاموش ارادوں کو آواز دیں،

زخموں کو معنی دیں،

اور امیدوں کو

پھر سے پَر لگا کر

بلندیوں کی طرف چھوڑ دیں۔

کیونکہ اصل طلوع

افق پر نہیں ہوتا

اصل صبح تو

انسان کے دل میں جنم لیتی ہے۔

سید فرخ رضا ترمذی

''خود کلامی''

کند ذہن تھا؟
یا لاپرواہی کا مارا؟
نہیں... شاید بے ادب؟
ارے نہیں----
بے ادب تو کبھی تھا ہی نہیں۔

ماں باپ کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا،
لب اف کے لفظ سے نا آشنا رہے،
استاد کا کہا تقدیس بن کر دل میں اترا،
سبق دل سے ازبر کیا،
ہر نصیحت کو راستے کی روشنی جانا،
یہی تو سیکھا تھا آغوشِ مادر میں
با ادب با مراد بے ادب، بے مراد

پھر آج چہرے پر یہ شکست کیوں؟
آنکھوں میں دکھ، مایوسی اور بے چینی کیوں؟
زندگی سے کوئی گلہ ہے...؟
ہاں ہے---
مگر کیوں کہوں تم سے،
اے میرے ہمزاد!
کیا تم میرے زخموں کی تپش کم کر سکو گے؟
جب مرہم تمہارے پاس نہیں
تو پرسش کا یہ دکھاوا بھی کیوں؟

یہ میری زندگی ہے،
میں ہی اس کے طوفانوں سے لڑوں گا۔
با مراد رہا یا لاحاصل رہ گیا سفر
اس حساب کا بوجھ بھی میرے ہی کندھوں پر ٹھیک ہے

مگر یہ اندر کی چپ----
یہ خود سے دوری----
کیوں سینے میں بند رکھتے ہو سب کچھ؟
کہہ ڈالو!
دل میں جو بھونچال ہے، زباں پر لے آؤ۔
نہیں؟
بے ادبی کا خوف ہے؟
گستاخی کی پرچھائیاں پیچھا کرتی ہیں؟
تو پھر حل؟----
اے میرے مسافر دل
کیا ہے؟
خاموشی --- اور بس خاموشی
اور دل میں سلگتی ہوئی چنگاری؟

نہیں ---- نہیں
میں نے خود کو اس دھول سے پاک کر لیا ہے
کسی کی خوشی دیکھوں تو دل میں چراغ جل اٹھتا ہے،
کسی کے غم سے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔
درد دیکھوں تو ہاتھ خود بخود بڑھ جاتا ہے۔

اور تم...؟
کہتے ہو میں صلہ مانگتا ہوں؟
اچھائی کے بدلے انعام؟
سیم و زر کا طلبگار؟
واہ رے انسان-----
کس چوراہے پہ لا کھڑا کیا---
جہاں میں لاحاصل تو بھی لاحاصل!

شبیر آکاش

وفاداری کا تسلسل [نثری نظم]

وقت کی سیڑھیاں چڑھتے
ہم یہاں تک آ پہنچے ہیں
وہ زمانہ، آنکھوں میں محفوظ
سبزے پر جمی کائی کی طرح
دل کے خشک صحرا میں
موم سی نرماہٹ رکھتا ہے

کبھی وقت کی برق رفتاری
مجھے مجسموں کے شہر میں لے آئی تھی
پتھروں کے ساتھ رہنے کا تجربہ
تمھارا چہرا
گداز موسم کی آغوش میں گزرے لمحے
مجھے سب یاد ہے

اب ایک رستہ
تمھارے گھر کی سمت جاتا ہے
تمھارا گھر
جس کا نیلا دروازہ
دُور سے نارنجی
قریب سے ہلکا گلابی— کیوں ہے؟

اب شاید
میں اندھیرے میں بہتر دیکھ سکتا ہوں
اور نیند کے غلاف سے لپٹے
خوابوں کی تعبیر جانتا ہوں

میں روزانہ
سورج طلوع ہونے سے پہلے
تمھارے ساتھ بیدار ہوتا ہوں
سارا دن
تمھارے خیال کی فراوانی میں
گزر جاتا ہے

اب تو
میرا دوست اُلو بھی
ساری رات جاگ کر
نئی صبح کا انتظار کرتا ہے

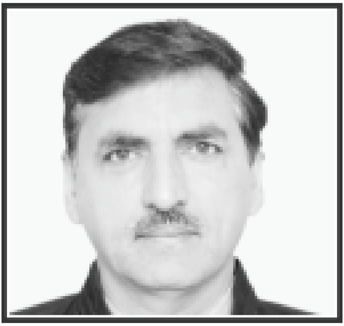

امجد بابر

دھرتی

اداس شام کے منظر میں ایک نغمہ نگار
پھسلتی ریت پہ بیٹھا کرے ہے سوچ بچار
قلم ہے ہاتھ میں کاغذ دھرے ہیں گھٹنوں پر
لکھے حکایتِ غم ناک دلِ نحیف و نزار
ازل سے ایک ہی منظر ہے آنکھ میں رقصاں
کنارِ آب پرندوں کا شور اور شکار
ذرا سی دیر میں بھرنے لگے گی پھر سے اڑان
نظر نواز کھلے پانیوں میں تیرتی ڈار
کہیں پہ دور بھڑکتے الاؤ کی ہلچل
کہیں پہ جگنوؤں کے بھیس میں بلند شرار
کہیں پہ رنگ بدلتے ہیں ابر سرخ سفید
کہیں پہ ریت ہے ڈھلتی ہوئی شفق کے دوار
کہیں قطار ہے گھر واپسی میں کونجوں کی
کہیں پہ سوئے مگرمچھ کہیں پہ سیپ ہزار
کہیں پہ چھوڑ گیا ہے لکیر سانپ کوئی
کسی کو ڈسنے لگا ہے کوئی خزندہ شعار
کہیں شکار کریں جانور ضعیف نفس
کہیں درندے چرندوں کی مرگ پر تیار

ہر ایک سمت ہے اک شور بھوک لالچ کا
ہر ایک جسم پہ چھایا ہے بے امان خمار
بقا کی جد و جہد میں ہر ایک مرتا ہوا
نہیں ملے گی کسی کو یہاں پہ راہ فرار
ہر اک ہے اپنے بچاؤ کی کوششوں میں نڈھال
کوئی نہیں ہے خطر نا شناس ناقہ سوار
ہر ایک سمت مداری کی شکل صیدِ ہوس
دکھانے لایا ہے ساحل پہ اپنے رنگ ہزار
جہاں ہے محو تماشا ہجومِ زندہ دلاں
جہاں پہ نعرۂ تحسین کا چڑھا ہے بخار
جہاں پہ نقد ہے سودا خدا پرستوں کا
جہاں ہے کارِ سیاست نہ کاروبار ادھار
جہاں بزرگ ہیں فارغ ز عقل ہوش و حواس
جہاں پہ طفل ہیں خطرے میں نوجواں بے کار
جہاں شکار ہے خاتون صیدِ خوف و ہراس
جہاں پہ جان ہے ایک اور ظالموں کی قطار

تو کیا رہے گا یہی مستقل جہاں کا طریق
تو کیا یہ طے ہے کہ یونہی رہیں گے لیل ونہار
اسی خیال میں تھا آنکھ لگ گئی اس کی
ذرا سی دیر تھا سویا کہ ہو گیا بیدار
کہ آ گئی تھی وہاں ایک مہ جبین پری
سماں تمام ہوا خوشگوار زمزمہ کار
اسے جو یاس کے عالم میں غمزدہ دیکھا
تو ہنس کے بول اٹھی اے شریف نغمہ نگار
تو اپنے آپ سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
سیاہ رات کے منظر میں صبح کے آثار
لباسِ مرگ میں مستور ہے عروسِ حیات
خزاں کی رت میں چھپا ہے فسونِ فصلِ بہار
ترا ہے کام فقط اک قلندرانہ صدا
ترا ہے فرض یہ آہ و فغاں نہ چیخ پکار
اب اٹھ کہ آنکھ میں پھر خواب کچھ سجانے ہیں
اب اپنے آپ کو پہچان اے غریب دیار
خدا کی دین ہے یہ شاعری ترا یہ ہنر
یہی ہے تیری عبادت ترا سماج سدھار

اورنگزیب حسام حُر

فاصلے [نثری نظم]

بڑھتی عمر کے ساتھ
فاصلے بھی بڑھنے لگتے ہیں
عمر گزشتہ کے ساتھ بندھے رشتوں کی گرہیں
ڈھیلی پڑنے لگتی ہیں
وقت بند مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتا چلا
جاتا ہے
زندگی مختصر لگنے لگتی ہے
کتنے رکے ہوئے کام یاد آنے لگتے ہیں
وقت ہی نہیں ملا کہ مکمل کر پاتے
رشتوں کی آبیاری خلوص ومحبت سے کرنے
کے باوصف بھی
تنہائی
ہاتھ آتی ہے
قدم سفر زیست میں سست ہوں تو
ساتھ چلنے والے کہاں رکتے ہیں
وقت کے سیل رواں کے سامنے
سب ناتے
تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں

کمرہ تنہائی سے آباد رہتا ہے
دل پر یادیں دستک دیتی
ہیں
باربار پرانی باتیں دہرانے کی عادت
سے اب تو سب اکتانے لگے ہیں
خود سے باتیں کرنا
اچھا لگتا ہے
عمر آخر میں اپنے سب سے اچھے سامع ہم
خود ہی ہوتے ہیں
خامشی اور تنہائی کی آنکھ مچولی سونے من
میں اٹھکیلیاں کرتی رہتی ہے
شاید
ہماری سوچ بھی ہمارے
جذبوں کی طرح متروک ہو چکی ہے

نائلہ راٹھور

شبِ یلدا

تنہائی کی طویل سیاہی بھری رات

ایک ہاتھ میں تیری یاد کا سوئی دھاگہ لیے

دوسرے ہاتھ میں تیرے زخم لیے

جدائی کی موم بتی جلائے سوچ رہی ہوں

شبِ تنہائی طویل ہے مگر

تیری یاد کا دھاگہ کم ہے

تیرے دان کیے زخم بڑے ہیں

گجرے

تا حد نظر گلابوں کے سلسلے

سرمئی آسمان کو مہکاتے ہوئے

کانٹوں کا منہ چڑاتے ہوئے

مجھ سے دور ہی دور ہنستے رہے

میری کلائیوں کے گجروں میں سمٹے نہیں

شرارت بھرے گلابوں کے سلسلے

بشریٰ شیریں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الگ جہاں سے تھے، لیکن جہاں کے ساتھ رہے

غبار ہو کے بھی ہم، کارواں کے ساتھ رہے

سپاس گزار [نثری نظم]

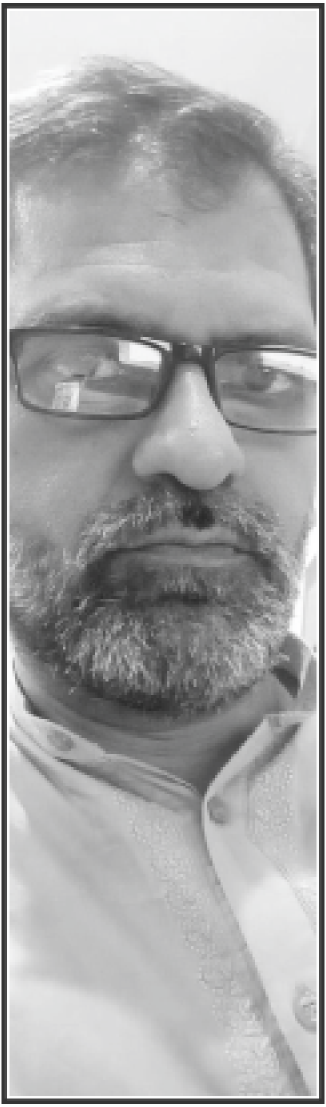

محمد عبداللہ

توتلی زبان سے
بولتا بچہ
رفتہ رفتہ
الفاظ کی ادائیگی پر
عبور حاصل کرنے کے بعد
قہقہے لگاتا،
لطیفے سناتا
مابین کھڑے ہوکر
پُرخلوص اور بےغرض احساس کی سرشاری سے
ہاں ہاں کی گردان کرتا
صلہ وستائش کی پرواہ کیے بغیر
خداداد صلاحیتوں سے
اِردگرد کے ماحول کو پرکھتا
خود سے ملنے کے لیے
وہ ایک بار پھر
لب بستہ
سپاس گزار ہے

بس ــــ ایک نظم

تنہائی میں تجھ کو جوتے ماروں گا
سب کے سامنے تیری نظر اتاروں گا

ایک منافق اور بڑھے گا دنیا میں
تیرے روپ میں خود کو ایسے ڈھالوں گا

اک انداز محبت والا رکھوں گا
اک انداز سے نفرت خوب ابھاروں گا

مجھ پر اک کہسار گرا ہے نفرت کا
زندہ رہا تو پھر سے جسم بنالوں گا

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چلو دل اُس کا وفادار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

بس یہی ہجر ہے

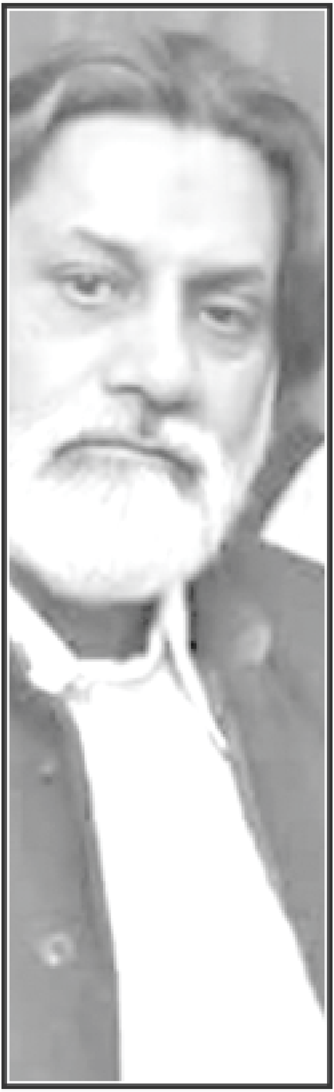

انگلیوں نے بدن کو ٹٹولا مگر
ہجر کی کرچیوں کے سوا کچھ بھی پایا نہیں
ہجر تینوں زمانوں کا وہ آئینہ
جس میں بچپن جوانی بڑھاپا سبھی کچھ ہے ترتیب میں
ہجر۔ بچپن کا ہے میٹھے آٹے کی روٹی
اور جوانی کا ہجر
تیز مرچوں کی چٹنی
پھر بڑھاپا ہے، بچپن جوانی کے گزرے دنوں کی
حسیں یاد کی
زرد چادر میں لپٹا ہوا ہجر ہے
پھر وہی فیصلہ
وصل بھی ہجر ہے ہجر بھی وصل ہے
ہجر تینوں زمانوں کا وہ آئینہ
جس میں بچپن جوانی بڑھاپا سبھی کچھ ہے ترتیب میں
بس یہی ہجر ہے بس یہ یہی زندگی!

اعجاز رضوی

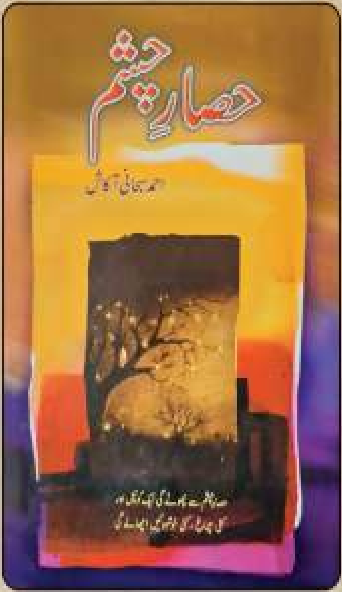
حصارِ چشم

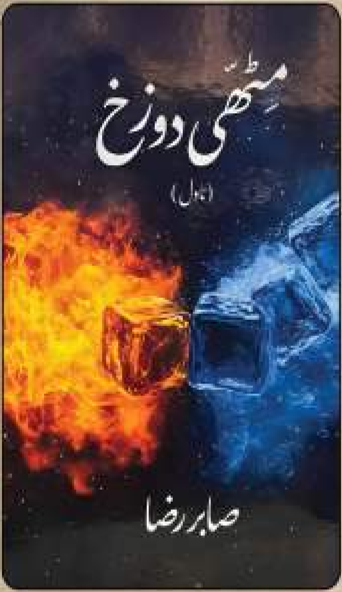
میٹھی دوزخ
(ناول)
صابر رضا

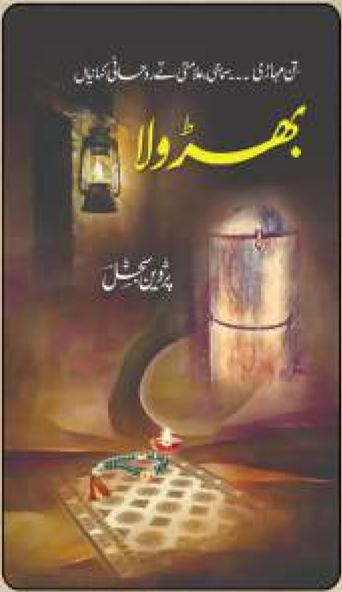
بھڑولا
پروین سجل

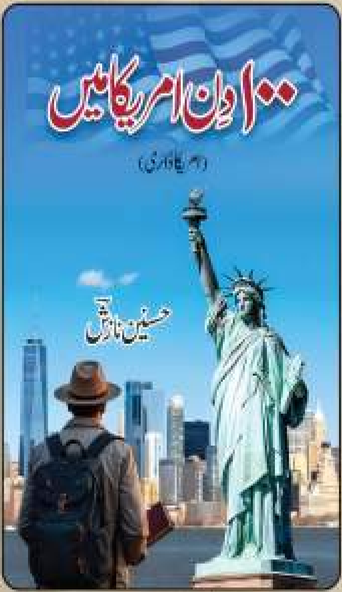
۱۰۰ دِن امریکا میں
حسنین نازش

تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
پہلی صدا پرندے کی
خالد احمد
نم گرفتہ
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
عرضِ ہنر
خالد احمد